سہ ماہی سماجی/دینی تحقیقی مجلّہ

نورِ معرفت

جلد:۹ شمارہ:۳ مسلسل شمارہ:۴۱

جولائی تا ستمبر 2018ء

مدیر
ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

ISSN 2221-1659
DECLARATION NO:7334

نورالہدیٰ مرکز تحقیقات
(اسلام آباد)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کلام الامام، امام الکلام

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا فلسفہ

امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

فَبَعَثَ اللّٰهُ مُحَمَّداً (صلی الله علیه و آله) بِالْحَقِّ لِيُخْرِجَ عِبَادَهُ مِنْ عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ إِلَى عِبَادَتِهِ وَ مِنْ طَاعَةِ الشَّيْطَانِ إِلَى طَاعَتِهِ بِقُرْآنٍ قَدْ بَيَّنَهُ وَ أَحْكَمَهُ لِيَعْلَمَ الْعِبَادُ رَبَّهُمْ إِذْ جَهِلُوهُ وَ لِيُقِرُّوا بِهِ بَعْدَ إِذْ جَحَدُوهُ وَ لِيُثْبِتُوهُ بَعْدَ إِذْ أَنْكَرُوهُ فَتَجَلَّى لَهُمْ سُبْحَانَهُ فِي كِتَابِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونُوا رَأَوْهُ بِمَا أَرَاهُمْ مِنْ قُدْرَتِهِ وَ خَوَّفَهُمْ مِنْ سَطْوَتِهِ وَ كَيْفَ مَحَقَ مَنْ مَحَقَ بِالْمَثُلَاتِ وَ احْتَصَدَ مَنِ احْتَصَدَ بِالنَّقِمَاتِ.

یعنی: " اللہ سبحانہ' نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کے بندوں کو محکم و واضح قرآن کے ذریعہ سے بتوں کی پرستش کی طرف اور شیطان کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت کی طرف نکال لے جائیں تاکہ بندے اپنے پروردگار سے جاہل وبے خبر رہنے کے بعد اسے جان لیں' ہٹ دھرمی اور انکار کے بعد اس کے وجود کا یقین اور اقرار کریں۔ اللہ ان کے سامنے بغیر اس کے کہ اسے دیکھا ہو قدرت کی (ان نشانیوں) کی وجہ سے جلوہ طراز ہے' کہ جو اس نے اپنی کتاب میں دکھائی ہیں اور اپنی سطوت و شوکت کی (قہرمانیوں سے) نمایاں ہے کہ جن سے ڈرایا ہے اور دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جنہیں اسے مٹانا تھا۔ انہیں کس طرح اس نے اپنی عقوبتوں سے مٹا دیا اور جنہیں تہس نہس کرنا تھا انہیں کیونکر اپنے عذابوں سے تہس نہس کر دیا۔

(نہج البلاغہ : خطبہ : ۱۴۵ سے اقتباس)

Declaration No: 7334

ISSN 2221-1659

سہ ماہی علمی و تحقیقی مجلّہ

نورِ معرفت

جلد: ۹
شمارہ: ۳
جولائی تا ستمبر
2018ء
بمطابق
ذیقعدہ
تا
محرم الحرام
۱۴۳۹_۴۰ھ

Noor-e-Marfat is indexed & Abstracted by Islamic Research Index (IRI) AIOU & HEC.

مدیر اعلیٰ
سید حسنین عباس گردیزی

مدیر
ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

معاون مدیر
سید رمیز الحسن موسوی

مجلس نظامت

- سید امتیاز علی رضوی — سرپرست اعلیٰ
- سید علی مرتضیٰ زیدی — سرپرست
- سید نعیم الحسن نقوی — مدیر انتظامی امور
- طاہر عباس — معاون دفتری امور
- بابر عباس — کمپوزنگ/ڈیزائننگ

پبلشر: سید حسنین عباس گردیزی

پرنٹر: پیکٹوریل پریس آبپارہ، اسلام آباد۔

ضروری نوٹ: مدیر کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

مجلس ادارت

- ڈاکٹر شیخ محمد حسنین
  المصطفیٰ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد
- ڈاکٹر علی رضا طاہر
  پنجاب یونیورسٹی، لاہور
- ڈاکٹر روشن علی
  اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، اسلام آباد
- ڈاکٹر ابوتراب
  قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد
- ڈاکٹر ساجد علی سبحانی
  المصطفیٰ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

قومی مجلس مشاورت

- ڈاکٹر سید نثار علی ہمدانی
  اے. جے. کے یونیورسٹی، آزاد کشمیر
- ڈاکٹر حافظ محمد سجاد
  علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد
- ڈاکٹر کرم حسین ودھو
  ریجنل ڈائریکٹوریٹ آف کالجز (لاڑکانہ)
- ڈاکٹر سید قندیل عباس کاظمی
  قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد
- ڈاکٹر محمد ریاض
  قراقرم یونیورسٹی، گلگت بلتستان

بین الاقومی مجلس مشاورت

- ڈاکٹر سید راشد عباس نقوی
  اہل بیت یونیورسٹی تہران، ایران
- ڈاکٹر یعقوب بشوی
  جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ قم، ایران
- ڈاکٹر سید تلمیذ حسنین رضوی
  نیو جرسی، امریکا
- ڈاکٹر غلام حسین میر
  جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ قم، ایران
- ڈاکٹر سکینہ حسین
  آسٹریلیا

رجسٹریشن

پاکستان، انڈیا: 500 روپے مڈل ایسٹ: 70 ڈالرز یورپ، امریکہ، کینیڈا: 150 ڈالرز

"نَمُت" ایک نظر میں

"نور الہدیٰ مرکز تحقیقات" (NMT) کا نصب العین (Vision) "مملکتِ خداداد پاکستان میں اسلامی تہذیب کی حاکمیّت ہے۔" لہٰذا "اسلامی تہذیب کی حاکمیّت کے قیام کے لئے اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج اور پاکستانی قوم میں دینی آگہی کا فروغ"، "نَمت" کا مشن (Mission) ہے۔ "نمت" کی فعالیت محض تعلیمی اور تحقیقی میدان میں محدود ہے اور یہ ادارہ اپنے اہداف کے حصول کے لئے اتحادِ امّت، بین المسالک ہماہنگی، تعمیری تنقید، درکِ متقابل اور تضاربِ آراء کا قائل ہے اور ہر اُس تحقیقی کاوش کو اپنے دامنِ نشر واشاعت میں جگہ دینے کا عہد کیے ہے جو اِس کے مشن سے ہماہنگ ہو۔

"نمت" کے تحقیقی منہج میں اسلامی تعلیمات کے اخذ واستخراج کے لئے قرآن کریم اور سنّت نبوی، اساسی منابع ہیں۔ لیکن یہ سنّت نبوی کے اُس طریق پر اعتماد کرتا ہے جو ائمہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کا طریق ہے۔ نیز ان منابع سے اسلامی تعلیمات کے اخذ واستخراج میں "نمت" اُس روش کا علمبردار ہے جو عقلی برہان، منطقی قیاس اور اجتہادی تتبّع اور تفحّص سے عبارت ہے۔

اب تک یہ ادارہ مختلف موضوعات پر 13 کتابیں اور سہ ماہی مجلّہ "نور معرفت" کے 40 شمارے پیش کر چکا ہے۔ تاہم اسے اپنے مشن کو جاری رکھنے کے لئے دانشوروں، علماء اور اہلِ قلم کے قلمی اور فکری تعاون کے ساتھ، علم دوست احباب کا مالی تعاون بھی درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے کرم فرماؤں کو ادارے کے لئے بہتر سے بہتر تحقیقات اور وسائل فراہم کرنے کے توفیق عطا فرمائے! (آمین!)

فہرست

نمبر شمار	موضوع	مؤلف	صفحہ
۱	اداریہ	مدیر	۵
۲	مطالعہ قرآن کے اساسی اصول (3)	ڈاکٹر شیخ محمد حسنین	۷
۲	تفسیر بالرائے اور تفسیر عقلی میں فرق	نذر حافی	۳۷
۳	حسنین شریفینؑ کا رسول اللہ ﷺ سے انتساب	سید رمیز الحسن موسوی	۵۳
۴	صلح کی اہمیت اور شرائط	ڈاکٹر روشن علی	۷۳
۵	واقعہ حرّہ، تاریخ کا ایک سیاہ ورق	ساجد علی گوندل	۹۳
108	RAZIQ HUSSAIN	ABSTRACTS	6.

اداریہ

مجرم ہمیشہ حق پر پردہ ڈال کر قانون کی گرفت اور احتساب کے عمل سے بچنا چاہتا ہے۔ اُسے کسی طور یہ پسند نہیں کہ کوئی دلیل و منطق حق کی حقانیّت کو برملا کر دے۔ لیکن قانونِ قدرت اور تقدیرِ الٰہی یہی ہے کہ جب بھی اہل جرم و جنایت حق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں گے، وہ اپنے لاریب کلمات اور براہین کے ذریعے حق کی حقانیّت کو برملا کر دے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ (یونس: ۸۲) تحقیق، درحقیقت سنّتِ پروردگار کی پیروی اور اہلِ جرم و جنایت کے خلاف کھلا جہاد ہے اور ایک محقق اپنی تحقیق کے ذریعے مجرمین کو عدالت و احتساب کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ دینی، سماجی اور انسانی علوم میں تحقیق، معاشرے میں جرم و جنایت کا سدّباب کرتی اور انسانیّت کو جادہ حق و حقانیّت کا راہی بناتی ہے۔ اگر اسلامی علوم میں تحقیق کے دوران، محقق کا مطمحِ نظر اپنی ذات اور ذاتی عقائد و افکار کے دفاع کی بجائے، محض سنّتِ پروردگار کی پیروی میں حق کی حقانیّت کو برملا کرنا ہو تو یہ اتنا بڑا جہاد ہے کہ ایسے محقق کے قلم کی سیاہی کی قدر و قیمت ہزاروں شہداء کے خون سے افضل قرار پاتی ہے۔

اسلامی معاشرے میں تحقیق کی اِسی اہمیّت کے پیشِ نظر ضرورت اِس امر کی ہے کہ عالمِ اسلام کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لئے مختص کیے گئے بجٹ سے کہیں زیادہ بجٹ اسلامی علوم میں تحقیق کے لئے مختص کیا جائے اور اس اہم کام پر دیگر شعبوں سے زیادہ انسانی وسائل خرچ کیے جائیں۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ تحقیق ہمارے لئے کوئی قدر و قیمت ہی نہیں رکھتی۔ خدا کرے معاملہ یہیں تک رکا رہے؛ کہیں ایسا نہ ہو کہ تحقیق ہمیں پسند ہی نہ ہو اور ہم وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ (الزخرف: ۷۸) کی آیت کا مصداق ٹھہریں۔ بہر صورت، ہر دور میں تحقیق کی شمع جلائے رکھنا اور تحقیقی مضامین و مواد کو معاشرے تک پہنچانا، ایک انتہائی اہم فریضہ ہے۔ الحمد للہ! سہ ماہی مجلّہ نورِ معرفت کے پلیٹ فارم سے ہمیں یہ توفیق حاصل رہی ہے کہ اپنی عقلی و فکری طاقت و توان کے مطابق اہلِ اسلام کی خدمت میں اسلامی افکار و نظریات کو تحقیق کے مراحل سے گزار کر پیش کرتے ہیں۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ تحقیق کے باب میں ہم نے آخری بات کہہ دی ہے، تاہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری حرکت کی جہت وہی ہے جو پروردگارِ عالم کی سنت ہے۔ اسی ڈگر پر قائم رہتے ہوئے مجلّہ نورِ معرفت کے موجودہ شمارے کو بھی محققینِ ذی وقار نے اپنی تحقیقی روح، عرق ریزی اور رشحاتِ قلم سے پانچ مقالات کی

صورت میں سجایا ہے۔اس شمارے میں قرآنیات پر دو انتہائی عمیق مقالات شامل ہیں جو قرآن فہمی کے آداب و مقدمات اور اصول و ضوابط، نیز قرآن کی درست تفسیر کی روش سے روشناس کرواتے ہیں۔

تیسرے مقالے میں ہادیانِ حق کی حقیقی شناخت کو اجاگر کرنے کی غرض و غایت سے حضرت امام حسن و امام حسین علیہما السلام کے رسول اکرم ﷺ کی طرف بحیثیتِ فرزند انتساب کی تحقیقی حیثیت اجاگر کی گئی ہے جس کے نتیجے میں حسنین شریفین کی اسلامی معاشرہ کے لئے ہادی و رہنما اور امام و پیشوا کی حیثیت مزید مسلم ہو جاتی ہے۔

چوتھے مقالے میں انسانی معاشرے کے ایک ایسے موضوع کے پیشِ نظر قلم اٹھایا گیا ہے جو انسان کی سماجی زندگی کا ایک لاینفک جزو اور درحقیقت، حق و باطل کی دائمی معرکہ آرائی کا شاخسانہ ہے۔ دراصل، صلح و جنگ کی داستان، حق و باطل کی رزم آرائی کی داستان ہے۔ لیکن اِس مقالہ میں واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے تناظر میں جنگ اور صلح، بذات خود اہمیّت نہیں رکھتے، جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ حق کا دفاع ہے اور اگر حق کا دفاع صلح کے ذریعے ہو سکتا ہو تو صلح ایسی جنگ اور بظاہر جہاد سے بھی افضل ہے جس کے نتیجے میں حق کی حقانیّت پر شک و تردید کے سائے منڈلانے لگیں۔

پانچویں مقالہ میں تاریخِ اسلام کے اُس باطل کردار کا ابطال کیا گیا ہے جسے بعض بیمار ذہنیت کے مالک مسلمان آج بھی خلیفۃ المسلمین قرار دینے کے لئے تگ و دَو میں مصروف ہیں۔اِس مقالہ میں واقعۂ حرّہ کو امّتِ اسلامی کے سامنے رکھنے سے یزیدیت کا ابطال مقصود ہے تاکہ مستقبل میں کسی دَور میں بھی مسلم امّت کسی ایسے شخص کو مسندِ اقتدار پر نہ لے آئے جس کی سیاہ کاریاں تاریخ انسانیت کا سیاہ ورق شمار ہوتی ہوں۔

دراصل، عالمِ اسلام اور اسلامی ممالک کی حکمرانی اور اقتدار کا معاملہ اتنا اہم ہے کہ اسے کبھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ہر دور میں یہ امکان موجود ہے کہ اسلامی معاشرہ کی سربراہی یزید صفت لوگوں کے ہاتھوں میں آجائے۔ لہٰذا اس سیاسی مسئلہ کو اسلامی علوم میں تحقیق سے الگ نہیں رکھا جاسکتا۔آج مسلم امّت کو جو چیلنج اور خطرات درپیش ہیں اُن میں خدا اُسے دین دار حکمرانوں کے انتخاب اور اُن کی حمایت کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اس تحقیقی مجلّہ کو پیش کرنے پر اور قارئین کو اس کے مطالعہ پر اجر و ہدایت عطا فرمائے۔آمین!

مطالعہ قرآن کے اساسی اصول (3)

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین*
sheikh.hasnain26060@gmail.com

کلیدی کلمات: قرآن فہمی، مطالعہ، اصول، قلب، دل، عقل وفطرت، نفس، تقویٰ، ہدایت، ارشاد۔

خلاصہ

زیر نظر مقالہ میں مطالعہ قرآن اور قرآن فہمی کا چوتھا اساسی اصول بیان ہوا ہے۔ اس اصول کے مطابق قرآن سے نورِ ہدایت پانے کے لئے قرآن کے قاری کا متقی ہونا شرط ہے۔ لیکن قرآن کریم نے تقویٰ کا تعلق، قلب سے جوڑا اور اسے قلب کی ایک خاص حالت قرار دیا ہے۔ جس قلب میں یہ حالت پائی جاتی ہو قرآن کریم نے اُس قلب کو قلبِ سلیم قرار دیا ہے اور جس قلب میں یہ حالت نہ پائی جائے قرآن کی منطق میں وہ قلب کہلانے کے لائق نہیں ہے۔

اس مقالہ میں یہ بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ قرآن جسے قلب قرار دیتا اور اُس کی ایک خاص حالت کو قرآن فہمی کی اساسی شرط قرار دیتا ہے، اُس سے مراد، گوشت کا وہ لوتھڑا نہیں جو پہلو میں دھڑکتا اور رگوں میں خون پمپ کرتا ہے بلکہ اس سے مراد، انسانی نفس اور روح وجان ہے جو کہ ایک روحانی اور معنوی امر ہے۔ اسی طرح اس مقالہ میں اس امر کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ اگر قلب سلیم کا مالک اور اہلِ تقویٰ ہونا، قرآن فہمی کی اساسی شرط ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن ایسے لوگوں کے لئے کتابِ ہدایت ہو جو اہلِ تقویٰ تو کجا، بے دین ہیں۔ نیز یہ کیسے ممکن ہے کہ جو شخص تقویٰ کی منزل پر فائز ہو، قرآن اُس کے لئے تقویٰ کا سامان فراہم کرے؟

*۔ محقق، استاذ فلسفہ اسلامی، پرنسپل دی ایمنز کالج، بارہ کہو، اسلام آباد۔

مقدمہ

یہ مقالہ مجلّہ نور معرفت میں "مطالعۂ قرآن کے اساسی اصول" کے عنوان کے تحت چھپنے والے مقالات کا تسلسل ہے۔ سابقہ مقالات کا مدعیٰ یہ تھا کہ قرآن کریم بنیادی طور پر فکر و فلسفے اور بشری علوم میں ہدایت سے زیادہ، عمل کے میدان میں انسان کی ہدایت کی کتاب ہے۔ ہاں، یہ الگ بات ہے کہ قرآن جہاں بعض کاموں کا حکم دیتا یا بعض سے روکتا ہے تو وہاں کئی مقامات پر اپنے اوامر و نواہی کو فکری بنیادیں بھی فراہم کر دیتا ہے۔ لہٰذا قرآن کے مطالعہ کے دوران قاری کو سب سے زیادہ عمل کے میدان میں رہنمائی کے حصول کے درپے رہنا چاہیے اور قرآن سے مختلف بشری علوم کے کسب اور استخراج کو ثانوی ترجیح قرار دینا چاہیے۔ جیسا کہ حصول رزق و روزگار، مصائب و مشکلات سے بچاؤ اور دنیاوی اغراض و مقاصد و حاجات کی برآوری کو بھی قرآن کی تلاوت کا تنہا ہدف نہیں بنانا چاہیے۔ قرآن کریم، کتاب ہدایت ہے لہٰذا اس سے عمل کے میدان میں ہدایت طلب کی جائے۔

مطالعۂ قرآن کا دوسرا اساسی اصول یہ بیان ہوا کہ قرآن فہمی کی تمام کوششیں تنہا قرآن کے معصوم معلّمین کی رہنمائی، یعنی پیغمبر اکرم ﷺ اور ائمۂ معصومین علیہم السلام کی سیرت و کردار اور احادیث کی روشنی میں نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہیں اور قرآن کا ہر وہ فہم جو قرآن کریم کے معصوم معلّمین علیہم السلام کے فہمِ قرآن سے تضادّ رکھتا ہو، باطل ہے۔

مطالعۂ قرآن کا تیسرا اساسی اصول یہ بیان ہوا کہ قرآن کریم سے بہتر سے بہتر نورِ ہدایت پانے کے لئے قاری کا عربی زبان و ادبیات، بعض قرآنی علوم اور تفسیر کے بنیادی اصولوں سے آشنا ہونا مطالعہ قرآن کی ایک بنیادی شرط ہے۔ نیز قرآن سے ہدایت پانے کے لئے اگرچہ قرآن کے قاری کا اپنے دور کے جدید ترین سائنسی انکشافات، فلسفی تأملات اور بشری علوم سے آشنا ہونا، قرآن سے ہدایت کے حصول کی شرط نہیں، تاہم قرآن کریم کے عمیق فہم کے لئے بشری علوم، منجملہ سائنسی علوم کے جدید ترین انکشافات سے آگاہی بہت مفید ہے۔ بالخصوص قرآن کریم کی ان آیات کے فہم میں جن کا موضوع، تشریعِ الٰہی سے زیادہ تکوینِ الٰہی ہے، سائنسی علوم سے آشنائی نہ فقط قرآن فہمی کا مقدمہ، بلکہ بعینہٖ فہمِ قرآن اور تفسیر

قرآن ہے۔ لہٰذا جہاں یہ عین ممکن ہے کہ اسلاف قرآن کریم سے نورِ ہدایت پانے میں اَخلاف سے بہت آگے ہوں، وہاں یہ بھی عین ممکن ہے کہ اَخلاف، عربی زبان و ادبیات، قرآنی علوم اور تفسیر کے بنیادی اصولوں سے آشنائی کے ساتھ ساتھ بشری علوم کے جدید ترین انکشافات سے آگاہی کے طفیل قرآن فہمی میں اسلاف سے اتنا آگے نکل جائیں کہ ان کی قرآنی فہمی کے مقابلے میں اسلاف کا فہم، بچگانہ فہم شمار ہو۔

مطالعہ قرآن کا چوتھا اساسی اصول

تقویٰ، قرآن فہمی کی اساسی شرط

مطالعہ قرآن کا چوتھا اساسی اصول یہ ہے کہ قرآن سے ہدایت پانے کے لئے اہلِ تقویٰ ہونا شرط ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" (البقرہ: ۲) یعنی: "یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں؛ یہ اہل تقویٰ کے لئے ہدایت ہے۔" یعنی قرآن کی ہدایت محض اہلِ تقویٰ سے مخصوص ہے اور جو شخص ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشات اور چاہتوں کا اسیر بن جاتا ہے، ایسے شخص پر قرآنی ہدایت و ارشاد کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کا اٹل فیصلہ ہے کہ جو شخص اہل تقویٰ نہیں، وہ کبھی قرآن کریم سے نورِ ہدایت نہیں پا سکتا۔ قرآن کا مطالعہ اُسے نہ تنہا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا، بلکہ اس کا خسارہ مزید بڑھاتا ہے: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا (الاسراء: ۸۲) یعنی: "اور ہم قرآن میں وہ چیز نازل فرمارہے ہیں جو ایمان والوں کے لئے شفاء اور رحمت کا موجب اور ظالموں کے نقصان میں اضافہ کا موجب ہے۔"

لہٰذا قرآن کریم سے نورِ ہدایت پانے کے لئے "تقویٰ" شرط ہے۔ لیکن تقویٰ بذات خود، قلب کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تقویٰ کا تعلق، دل سے جوڑا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِمْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى (الحجرات: ۳) یعنی: "اللہ نے اُن کے دلوں کو تقویٰ کے لئے آزما لیا ہے۔" ایک اور جگہ ارشاد ہے: فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔ (الحج: ۳۲) یعنی: "یقینا (شعائر الٰہی کی یہ

تعظیم) دلوں کا تقویٰ ہے۔" اس کے برعکس، قرآن کریم نے بے تقوائی کا تعلق بھی دل سے جوڑا ہے۔ ارشاد ربّانی ہے: فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (البقرۃ: ۲۸۳) یعنی: "تو یقیناً اُس کا دل گنہگار ہے۔"

پس تقویٰ اور بے تقوائی انسانی قلب و دل کی خاص کیفیات کا نام ہے۔ اگر قلب میں تقویٰ کی کیفیت پائی جائے تو قرآن اُسے "قلبِ سلیم" کا نام دیتا ہے اور اگر قلب میں بے تقوائی کی کیفیت پائی جائے تو قرآن اُسے "مریض قلب" قرار دیتا ہے۔ جس شخص کا قلب سلیم ہو وہ آسانی سے اپنے اعمال و کردار کو ضبط میں لاسکتا اور متقی کہلاتا ہے۔ برعکس، جس شخص کا دل مریض ہو وہ نہ تو اپنے اعضاء و جوارح پر کنٹرول جماسکتا ہے اور نہ ہی اپنے اعمال میں شریعت کی پابندی کرسکتا ہے۔ ایسا شخص فاسق کہلاتا ہے۔

پس قرآنی ہدایت و ارشاد کے لئے قلبِ سلیم کا مالک ہونا ضروری ہے۔ اور قرآن کریم کی بعض آیات کی روشنی میں تنہا قلبِ سلیم ہی قلب کہلا سکتا ہے۔ جو قلب سلیم نہیں گویا قرآن کی منطق میں وہ قلب نہیں اور جو قلب، قلب کہلانے کے لائق نہیں، وہ قرآن کے نزول کا ظرف قرار نہیں پا سکتا۔ کیونکہ قرآن قلب پر نازل ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ: ۹۷) یعنی: "جبریل نے اِس (قرآن) کو اللہ کے حکم سے آپ ﷺ کے دل پر اتارا ہے۔" ایک اور جگہ ارشاد ہے: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ (الشعراء: ۱۹۳) یعنی: "اسے روح الامین (جبرائیل علیہ السلام) لے کر اترا ہے، آپ کے قلب پر۔" مزید ارشاد ہے: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (ق: ۳۷) یعنی: "بے شک اس میں یقیناً تذکّر ہے اُس شخص کے لئے جو صاحبِ دل ہو۔

قرآن کی منطق میں جو قلب سلیم نہ ہو، دل نہیں، پتھر ہے: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (البقرۃ: ۷۴) یعنی: "اس کے بعد تمہارے دل سخت ہوگئے چنانچہ وہ پتھروں جیسے یا اُن سے بھی زیادہ سخت ہیں۔" دوسرے الفاظ میں قلبِ سلیم انسانیّت کا گوہر ہے۔ قلبِ سلیم کا مالک خلیل الرحمٰن بنتا اور نبوت و امامت کے بلند و بالا مراتب پر فائز ہوتا ہے: اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (الصافات: ۸۴) یعنی: "جب وہ اپنے رب کی بارگاہ میں قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہوئے۔" اور جو شخص قلبِ سلیم کا مالک نہ ہو، انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ

بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الأعراف: ۱۷۹) یعنی: "یہ افراد دل رکھتے ہیں، مگر ان سے سمجھ نہیں سکتے اور آنکھیں رکھتے ہیں، مگر ان سے دیکھ نہیں سکتے اور کان رکھتے ہیں، مگر ان سے سن نہیں سکتے۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔"

بنابریں، قلبِ سلیم کا مالک ہونا، نہ تنہا قرآن فہمی کی اساسی شرط بلکہ انسان کی وہ متاع ہے جو عالم آخرت میں اُس وقت اُس کے کام آئے گی جب مال و اولاد کام نہ آئیں گے: يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (الشعراء: ۸۸-۸۹) یعنی: "جس دن نہ کوئی مال نفع دے گا اور نہ اولاد؛ مگر وہی شخص (نفع مند ہوگا) جو اللہ کی بارگاہ میں قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہوا۔"

دل کیا ہے، کہاں ہے؟

اگر قرآن کریم سے نورِ ہدایت پانے کا ایک اساسی اصول، تقویٰ اور قلبِ سلیم کا مالک ہونا ہے تو یقینا ہمیں یہ جستجو کرنا ہوگی کہ قلب کی ماہیت کیا ہے اور یہ کہاں ہے؟ آیا اس سے مراد، گوشت کا وہ لوتھڑا ہے جسے طبّی اصطلاح میں "دل" کہا جاتا ہے؟ یا اس سے مراد کچھ اور ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ قلب جو ہدایت و ارشاد الٰہی کا مرکز ہے، وہ سینے کے اندر موجود وہ مادی عضو نہیں ہے جس کا کام رگوں میں خون پمپ کرنا ہے۔ کیونکہ اگر ہم قلب کی اُن خصوصیات اور صفات کو دیکھیں جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں تو یہ صفات گوشت کے اُس لوتھڑے پر صادق نہیں آتیں جسے طبّی قلب کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے قلب کے دو قسم کے حالات و کیفیات بیان کیے ہیں:

پسندیدہ حالات و کیفیات

1. **رقّت:** اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ (الحدید: ۱۶)
یعنی: "کیا ایمان والوں کے لئے (ابھی) وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کی یاد کے لئے رِقّت کے ساتھ جھک جائیں۔"
2. **پاکیزگی:** أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَن يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ (المائدہ: ۴۱)

یعنی: " یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو پاک کرنے کا اللہ نے ارادہ (ہی) نہیں فرمایا۔"

3. **سلامتی**: إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (الصافات: ۸۴) یعنی: "جب وہ اپنے رب کی بارگاہ میں قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہوئے۔"

إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (الشعراء: ۸۹۔) یعنی: "مگر وہ شخص (نفع مند ہوگا) جو اللہ کی بارگاہ میں سلامتی والے دل کے ساتھ حاضر ہوگا۔"

4. **رغبت و میلان**: فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ (ابراہیم: ۳۷)

یعنی: " (اے اللہ) تو لوگوں کے دلوں کو ایسا بنادے کہ وہ ان کی طرف مائل ہو جائیں۔"

5. **بازگشت اور رجوع**: وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ (ق: ۳۳)

یعنی: "اور (اللہ کی بارگاہ میں) لوٹ کر آنے والا دل لے کر حاضر ہوا۔"

6. **انس و الفت**: وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ (الانفال: ۶۳)

یعنی: "اور ان کے قلوب کے مابین الفت ڈال دی"۔

7. **نرمی اور ملائمت**: ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (الزمر: ۲۳)

یعنی: " پھر اُن کی جلدیں اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔"

8. **مہربانی اور رحمت**: وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً (الحدید: ۲۷)

یعنی: " اور ہم نے اُن لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے اُن (عیسٰی علیہ السلام) کی پیروی کی مہربانی اور رحمت ڈال دی۔"

9. **اطمینان**: وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي؛ (البقرہ ۲۶۰) یعنی: "لیکن چاہتا ہوں کہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو جائے۔"

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الرعد: ۲۸)

یعنی: "آگاہ رہو کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔"

10. **سکون**: هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ (الفتح: ۴)

یعنی: "وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکون ڈالا۔"

11. **امتحان وآزمائش**: اِمْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ (الحجرات: ۳)

یعنی: "وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکون ڈالا۔"

12. **ایمان**: وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (الحجرات: ۱۴)

یعنی: "اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔"

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ (المجادلہ: ۲۲)

یعنی: "یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت فرمادیا ہے۔"

13. **تقویٰ**: وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ (الحج: ۳۲)

یعنی: "اور جو شخص اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ بھی دلوں کا تقویٰ ہے۔"

14. **سمجھ بوجھ**: فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا (الحج: ۴۶)

یعنی: "کہ اُن کے دل (ایسے) ہو جاتے جن سے وہ سمجھ سکتے۔"

15. **نصیحت**: إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ (ق: ۳۷)

یعنی: "بے شک جو صاحبِ دل ہے اِس میں اُس کے لئے نصیحت ہے۔

16. **ہدایت**: وَمَن يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ (التغابن ۱۱)

یعنی: "اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے تو وہ اُس کے دل کو ہدایت فرمادیتا ہے۔"

17. **رعب**: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (الانفال: ۲)

یعنی: "مومن تو بس وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل (اس کی عظمت وجلال کے تصور سے) رعب زدہ ہو جاتے ہیں۔"

ناپسندیدہ حالات وکیفیات

1. **سختی وسنگدلی**: وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: ۱۵۹)

یعنی: "اور اگر آپ تُندخُو، سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے گرد سے چھٹ کر بھاگ جاتے۔"

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم (البقرہ: ۷۴) یعنی: "پھر تمہارے دل سخت ہو گئے۔"

وَلٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ (الانعام: ۴۳) یعنی: "لیکن اُن کے دل سخت ہو گئے۔"

فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِن ذِكْرِ اللَّهِ (الزمر: ۲۲)

یعنی: "اُن لوگوں کے لئے ہلاکت ہے جن کے دل اللہ کے ذکر سے (محروم ہو کر) سخت ہو گئے۔"

2. **اضطراب**: قُلُوب يَوْمَئِذٍ وَاجِفَة (النازعات: ۸)

یعنی "قیامت کے دن (لوگوں کے) دل خوف و اضطراب سے دھڑکتے ہوں گے۔"

3. **بے قراری**: وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَى فَارِغًا (القصص: ۱۰)

یعنی: "اور موسیٰ کی والدہ کا دل بے قرار ہو گیا۔"

4. **حسرت**: لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ (آل عمران: ۱۵۶)

یعنی: "تاکہ اللہ اس (گمان) کو ان کے دلوں میں حسرت بنائے رکھے۔"

5. **غم و غصہ**: وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ (التوبہ: ۱۵)

یعنی: "اور ان کے دلوں کا غم و غصہ دور فرمائے گا۔"

6. **غفلت**: وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ (الکہف: ۲۸)

یعنی: "تو اس شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے غافل کر دیا ہے۔"

7. **گناہگار**: وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (البقرہ: ۲۸۳)

یعنی: "اور جو شخص گواہی کو چھپاتا ہے تو یقیناً اس کا دل گنہگار ہے۔"

8. **بیماری**: فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ (الاحزاب: ۳۲۔)

یعنی: "کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ لالچ کرنے لگے۔"

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا (البقرہ: ۱۰)

یعنی: "اُن کے دل میں بیماری ہے سو اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ہے۔"

9. **کجی**: كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ (التوبہ: ۱۱۷)

یعنی: "قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل کج ہو جاتے۔"

10. **جھکاؤ:** فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا (التحریم: ۴)

یعنی: "تم دونوں کے دل (غلط سمت میں) جھک گئے ہیں۔"

وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ (الانعام: ۱۱۳)

یعنی: "اور تاکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے دل چکنی چپڑی باتوں کی طرف جھکے رہیں۔"

11. **لہو ولعب:** لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ (الانبیاء: ۳) یعنی: "ان کے دل لغویات میں محو ہیں۔"

12. **نفی وانکار:** وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ (التوبہ: ۸) یعنی: "ان کے دل نفی کرتے ہیں۔"

قُلُوبُهُم مُّنكِرَةٌ (النحل: ۲۲) یعنی: "ان کے دل منکر ہیں۔"

13. **نفاق:** فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ (التوبہ: ۷۷)

یعنی: "پس اس نے ان کے دلوں میں نفاق کو انجام بنا دیا۔"

14. **اندھاپن:** وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (الحج: ۴۶)

یعنی: "لیکن سینوں میں (موجود) دل اندھے ہو جاتے ہیں۔"

15. **نفرت:** اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ (الزمر: ۴۵)

یعنی: "جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اُن کے دل گھٹن اور نفرت کا شکار ہو جاتے ہیں۔"

16. **ہٹ دھرمی:** إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ (الفتح: ۲۶)

یعنی: "جب کافر لوگوں نے اپنے دلوں میں ہٹ دھرمی رکھ لی۔"

17. **ارادہ:** وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ (الاحزاب: ۵)

یعنی: "لیکن جس کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا۔"

18. **ارتکاب:** وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ (البقرہ: ۲۲۵)

یعنی: "مگر جس کا تمہارے دلوں نے ارتکاب کیا اُس پر تمہارا مؤاخذہ فرمائے گا۔"

19. **مخالفت:** مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ (النجم: ۱۱)

یعنی: "دل نے اُس کے مخالفت نہ کی۔"

20. **گھبراہٹ**: حَتَّىٰ إِذَا فُزِّعَ عَن قُلُوبِهِمْ (سباء: ۲۳)
یعنی: " یہاں تک کہ اُن کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جائے گی۔"
21. **مہر لگنا**: وَخَتَمَ عَلَىٰ قُلُوبِكُم (الانعام: ۴۶) یعنی: "اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔"
وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ (التوبہ: ۸۷) یعنی: "ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔"
22. **ٹیڑھا پن**: فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ (الصّف: ۵)
یعنی: " پھر جب انہوں نے کجروی کی تو اللہ نے اُن کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔"
رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا (آل عمران: ۸) یعنی: " پروردگارا! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ فرما۔"
23. **زنگ**: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم (المطففین: ۱۴)
یعنی: " ہر گز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے۔"
24. **پردے**: وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ (فصّلت: ۵) یعنی: " ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔"
وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً (الاسراء: ۴۶) یعنی: "اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے۔"
25. **تالے**: أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (محمد: ۲۴)
یعنی: " آیا اُن کے دلوں پر تالے (لگے ہوئے) ہیں۔"
26. **اغفال**: أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا (الکہف: ۲۸)
یعنی: " ہم نے اس کے دل کو اپنے ذکر سے غافل کر دیا۔"

مذکورہ بالا کم و بیش ۴۵ حالات و کیفیات، گوشت کے ایک لوتھڑے کے حالات و کیفیات قرار نہیں پا سکتے۔ بنابریں، قرآن کریم جسے قلب قرار دیتا ہے، اس سے مراد انسان کا نفس و جان اور اُس کی روح ہے۔ جو ایک قدسی اور معنوی امر اور مادے سے مجرد حقیقت ہے۔ حالانکہ صنوبری قلب ایک مادی عضو ہے اور مادی عضو میں یہ صلاحیت نہیں کہ اُس میں علم جیسی مجرد حقیقت سما سکے یا اُس کی طرف ایسی کیفیات و حالات کی نسبت دی جائے جو انسان کی فکری، معنوی اور روحانی کیفیات ہیں۔ اگر قلب ایک مجرد

حقیقت نہ ہوتا تو اس میں یہ ظرفیت نہ پائی جاتی کہ " نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ عَلٰي قَلْبِكَ " کے قرآنی خطاب کا مصداق بنے۔ کیونکہ قرآنی تعلیمات مجرد ہیں، لہٰذا اُن کا ظرف بھی مادے سے مجرد ہونا چاہیے۔ ہاں! یہاں یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر قلب سے مراد، انسانی نفس ہے تو قرآن کریم نے نفس کو " قلب " کا عنوان کیوں دیا ہے؟ ہمارے خیال میں شاید اِس لئے کہ نفس، انسان کی انسانیت کا جوہر ہے اور ہر چیز کے جوہر کو " قلب " کہا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم نے اسی معنی میں نفس کے لئے قلب کا کلمہ استعمال کیا ہے۔ اس دعویٰ پر مزید دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں جن حالات و کیفیات کی نسبت قلب کی طرف دی گئی ہے، ان میں سے کئی ایک کی نسبت نفس سے بھی برقرار کی ہے۔ ذیل کی آیات میں قلب و نفس کی متقارب صفات و حالات بیان ہوئے ہیں جو بذات خود قلب و نفس کے ایک حقیقت ہونے کی دلیل ہے:

1. **فہم، تعقل اور الہام:**

دل: فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا (الحج: ۴۶) یعنی: " کہ اُن کے دل (ایسے) ہو جاتے جن سے وہ سمجھ سکتے۔ "

نفس: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (الشمس: ۷-۸) یعنی: " پھر اس نے اسے اس (نفس) کو بدکاری اور پرہیزگاری (کا الہام کر دیا۔ "

2. **طہارت و تزکیہ**

دل: لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَن يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ (المائدہ:۴۱) یعنی: " یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو پاک کرنے کا اللہ نے ارادہ (ہی) نہیں فرمایا۔ "

نفس: قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا (الشمس:۹) یعنی: " بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو پاک کیا۔ "

3. **اطمینان:**

دل: لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي یعنی: " میرا دل مطمئن ہو جائے۔ "

نفس: يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (سورۃ الفجر:۲۷) یعنی: " اے اطمینان پا جانے والے نفس۔ "

4. خوف

دل: قُلُوب يَوْمَئِذٍ وَاجِفَة (النازعات:۸) یعنی" قیامت کے دن (لوگوں کے) دل خوف و اضطراب سے دھڑکتے ہوں گے۔"

نفس: فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ (طہ: ٦٧) یعنی: "تو موسٰی (علیہ السلام) اپنے دل میں ایک چھپا ہوا خوف سا پانے لگے۔"

5. ہوا و ہوس

دل: فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ (ابراہیم:۳۷) یعنی: " (اے اللہ) تو لوگوں کے دلوں کو ایسا بنا دے کہ وہ ان کی طرف مائل ہو جائیں۔"

نفس: وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ (النازعات:۴۰) یعنی: "اور اُس نے (اپنے) نفس کو خواہشات و شہوات سے باز رکھا۔"

6. ارادہ و رغبت

دل: وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ (الاحزاب:۵) یعنی: "لیکن جس کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا۔"

نفس: فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ (المائدہ:۳۰) یعنی: "پھر اس (قابیل) کے نفس نے اس کے لئے اپنے بھائی (ہابیل) کا قتل مرغوب) کر دکھایا۔"

7. ایمان و یقین

دل: كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ (المجادلہ: ۲۲) یعنی: "یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت فرما دیا ہے۔"

نفس: وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ (النمل:۱۴) یعنی: "حالانکہ ان کے دل ان (نشانیوں کے حق ہونے) کا یقین کر چکے تھے۔"

نتیجہ یہ کہ قلب، وہی نفس ہے یا نفس کی ایک شان اور شعبہ ہے۔ لہٰذا قرآنی ہدایت کے حصول کے لئے قلب کے تقویٰ و تطہیر سے انسان کے پہلو میں دھڑکتے گوشت کے لوتھڑے کا آپریشن مراد نہیں، بلکہ اس سے مراد،

انسان کے نفس وروح کی پاکیزگی ہے۔اس امر کا ایک شاہد یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی ہدایت وارشاد کا دروازہ اُن لوگوں پر بند قرار دیا ہے جو طہارتِ نفس کے مالک نہ ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (الواقعہ: ۷۷-۷۹) یعنی: "بے شک یہ بڑی عظمت والا قرآن ہے۔یہ ایک پوشیدہ کتاب (لوح محفوظ) میں (لکھا ہوا) ہے۔اس کو پاک لوگوں کے سوا کوئی نہ چُھوئے گا۔" اس آیت میں انسان کے نفس وروح کی پاکیزگی کو قرآنی حقائق تک رسائی کی شرط قرار دیا گیا ہے جو اس امر کا قرینہ ہے کہ قلبِ سلیم سے مراد، نفس کی پاکیزگی ہے۔اگر انسان کا نفس پاکیزہ ہو تو قرآن کا مطالعہ اُس کے لئے مفید ہے اور اگر نفس میں پاکیزگی نہیں تو قرآن کا مطالعہ انسان کی دستگیری نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر ایک شخص قرآن کے عمیق و عظیم مطالب تک رسائی کا خواہاں ہے تو اُسے تقویٰ اپنانا ہوگا اور اپنے نفس وروح کی پاکیزگی اور طہارت کا سامان مہیا کرنا پڑے گا۔ یقیناً وہ تقویٰ اور طہارتِ نفس کی وادی میں جس قدر آگے بڑھتا چلا جائے گا، قرآنی ہدایت و ارشاد کے دروازے اُسی قدر اس پر زیادہ سے زیادہ کھلتے چلے جائیں گے۔

نہ تحصیلِ حاصل، نہ نقضِ غرض

اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم کتابِ ہدایت ہے اور اِس کے نزول کی غرض و غایت انسانی نفوس کی تطہیر و تزکیہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ (جمعہ: ۲) یعنی: " (خدا) وہی ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن پر اُس کی آیتیں پڑھ کر سناتے اور اُن کو پاک کرتے ہیں۔" لیکن مطالعہ قرآن کا چوتھا اساسی اصول یہ کہتا ہے کہ : ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (البقرہ: ۱-۴) یعنی: " (یہ) وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، (یہ) اہلِ تقویٰ کے لئے ہدایت ہے۔ جو غیب پر ایمان رکھتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے (ہماری راہ) میں خرچ کرتے ہیں؛ وہ لوگ جو آپ کی طرف نازل

کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا (سب) پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ آخرت پر بھی (کامل) یقین رکھتے ہیں۔ وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی حقیقی کامیابی پانے والے ہیں۔"

قرآن کریم کی ان آیات کے مفہوم کو دیکھا جائے تو بجا طور پر یہ سوال درپیش ہے کہ غیب پر ایمان رکھنے والا، نماز قائم کرنے والا، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا، قرآن اور قرآن سے قبل نازل ہونے والی آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنے والا اور آخرت پر یقین کامل رکھنے والا انسان تو متقی، قلبِ سلیم کا مالک، نفسِ زکیہ کا صاحب اور ہدایت یافتہ انسان ہوتا ہے، اُسے ہدایت کی کیا ضرورت کہ قرآن اُس کے لئے ہدایت کا موجب بنے؟ اس کے برعکس، جو لوگ نہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نہ نماز قائم کرتے ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں انفاق کرتے ہیں، نہ قرآن اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت پر اُن کا کوئی ایمان ہے، یقیناً یہ لوگ فاسق، مریض دل، آلودہ نفس اور بے تقویٰ ہیں اور ایسے ہی لوگوں کو ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہے جبکہ مطالعہ قرآن کا چوتھا اساسی اصول ایسے لوگوں کو قرآن سے نورِ ہدایت پانے سے محروم ٹھہرا دیتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ قرآن نہ تو متقی کے کام آیا، نہ بے تقویٰ کے کام۔ پس قرآن کس کے لئے اتارا گیا ہے؟ علمی اصطلاحات میں یہ اشکال یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ اہلِ تقویٰ کے لئے ہدایت کا حصول، بے فائدہ اور تحصیلِ حاصل ہے لہٰذا قرآن ان کے کام نہیں آ سکتا۔ جہاں تک بے تقویٰ لوگوں کا تعلق ہے تو اُن پر قرآنی ہدایت و ارشاد کا دروازہ اس لئے بند ہے کیونکہ وہ ہیں ہی بے تقویٰ۔ قرآن ان کے کام بھی نہیں آ سکتا اور اُن کے نفوس کا تزکیہ نہیں کر سکتا جو کہ نقضِ غرض ہے۔ دوسری جانب قرآن کی بارگاہ میں نہ تحصیلِ حاصل کی نسبت درست ہے، نہ نقضِ غرض کی۔ تو اِس محذور سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا اجمالی جواب یہ ہے کہ قرآن اہلِ تقویٰ ہی کے لئے سامانِ ہدایت ہے اور اس میں کوئی تحصیلِ حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ تقویٰ کی دو اقسام ہیں: **ایک**، وہ تقویٰ جو قرآن فہمی کی بنیادی شرط (Pre-condition) ہے۔ **دوسرا**، وہ تقویٰ جو قرآن فہمی کا نتیجہ (Outcome) اور ماحصل ہے۔ جب تک ایک شخص اس معنی میں متقی نہ ہو جس معنی میں تقویٰ قرآن فہمی کی بنیادی شرط ہے، اسے مطالعہ قرآن سے سامانِ ہدایت میسر نہیں آ سکتا لیکن اگر انسان اُس تقویٰ کا صاحب ہو جو قرآن کے فہم کی بنیادی شرط ہے تو وہ مطالعہ قرآن کے ذریعے تقویٰ کی اُن منازل پر فائز ہو جاتا ہے جن پر اس سے پہلے فائز نہ تھا اور قرآن فہمی کے نتیجہ میں ان پر فائز ہوا۔

پس اہلِ تقویٰ کا قرآن سے ہدایت و ارشاد پانا، ترقی ہے، تحصیل حاصل نہیں۔ اسی طرح قرآنی ہدایت و ارشاد پانے کے لئے تقویٰ کے بنیادی شرط ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہر شخص کو ہر حال میں پہلے صوم و صلاۃ اور حج و زکاۃ کا پابند ہونا چاہیے تب وہ قرآن سے نورِ ہدایت پا سکتا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن فہمی کی بنیادی شرط جو تقویٰ ہے اُس سے مراد انسان کا اپنی عقل و فطرت کے احکام کا پابند ہونا ہے۔ لہٰذا جو شخص اہلِ عناد نہیں اور حق و حقیقت کی بات کو تسلیم کرنے میں لیت و لعل نہیں کرتا ایسا شخص چاہے مسلمان نہ ہو اور اُس کے حق میں احکام شریعت کی پابندی کے معنی میں تقویٰ قابل تحقق نہ بھی ہو، تب بھی قرآنی ہدایت و ارشاد اُس کے شامل حال ہو سکتی ہے اور قرآن کی غرض و غایت کے لحاظ سے نقضِ غرض کا اشکال پیش نہیں آتا۔

دیندار گمراہ اور بے دین متقی؟

یہاں بجا طور پر ایک اور سوال جنم لیتا ہے اور وہ یہ کہ آیا ہدایت کا محتاج، ایک بے دین انسان اہلِ تقویٰ ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب پانے کے لئے اِس نکتہ پر توجہ ضروری ہے کہ دینداری اور تقویٰ کے لحاظ سے انسان کی چار قسمیں قابلِ تصوّر ہیں:

1. فاسق دین دار
2. فاسق بے دین
3. متقی دین دار
4. متقی بے دین

ان اقسام میں سے جہاں تک پہلی قسم کا تعلق ہے تو اس کا معاملہ بڑا واضح ہے۔ کیونکہ جس شخص کا دل مریض اور نگاہ لاابالی ہو وہ زباں سے "لا الٰہ الّا اللہ" کہہ بھی دے تو منافق شمار ہوتا ہے۔

زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

منافق اُسی شخص کو کہا جاتا ہے جس نے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو لیکن اُس کا دل مریض اور عمل فسق و عصیان کی بنیاد پر استوار ہو۔ یقیناً ایسے فاسق و منافق دین دار پر قرآن اپنی ہدایت و ارشاد کا دروازہ بند کر دیتا

ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ يُخَادِعُونَ اللّٰهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلاَّ أَنفُسَهُم وَمَا يَشْعُرُونَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ (البقرۃ: ۱۰) یعنی: " اور لوگوں میں سے بعض وہ (بھی) ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یومِ قیامت پر ایمان لائے حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں مگر وہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دیتے ہیں اور انہیں اس کا شعور بھی نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں بیماری ہے، پس اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ جھٹلاتے تھے۔"

مذکورہ بالا اقسام میں جہاں تک دوسری قسم یعنی "فاسق بے دین" کا تعلق ہے تو اگرچہ عرفِ عام میں بے دین انسان کو ہمیشہ فاسق ہی سمجھا جاتا ہے لیکن اس سے ہماری مراد ایسا شخص ہے جو نہ اصولِ دین کو قبول کرتا ہو اور نہ ہی کسی انسانی اور اخلاقی ضابطے کا پابند ہو۔ یقیناً قرآن کریم ایسے شخص کے لئے بھی کسی طور ہدایت کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی ایسے شخص کو قرآن کا مطالعہ کوئی فائدہ پہنچاتا ہے۔

جہاں تک تیسری قسم، یعنی متقی دین دار انسان کا تعلق ہے تو اِس کے حوالے سے تحصیلِ حاصل کا اشکال پیش آتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے حوالے سے سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دین دار بھی ہو، اہل تقویٰ بھی ہو اور در عینِ حال گمراہ اور قرآنی ہدایت وارشاد کا محتاج بھی ہو؟ اگر اِس سوال کا جواب یہ ہو کہ دین دار اور متقی انسان ہدایت یافتہ ہی ہوتا ہے تو تحصیلِ حاصل کا اشکال پیش آئے گا۔ تاہم یہ اشکال بھی ادنیٰ التفات و توجہ سے برطرف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص دین دار بھی ہو، اہل تقویٰ بھی ہو اور در عینِ حال قرآنی ہدایت وارشاد کا محتاج بھی ہو۔

اِس امر کی توضیح یہ ہے کہ تقویٰ ایک بسیط حقیقت نہیں کہ اس کا معاملہ بود و نبود اور ہست و نیست کے درمیان دائر ہو، بلکہ تقویٰ ایک ذوالمراتب حقیقت ہے۔ تقویٰ کسی جامد اور راکد منزل کا نام نہیں کہ اگر ایک شخص چند دینی اوامر و نواہی کا پابند ہو جائے تو یہ کہا جائے کہ اُس نے سب کچھ پا لیا ہے اور اُس کے لئے قرآنی ہدایت وارشاد تحصیلِ حاصل کا مصداق ٹھہرے۔ نہیں، نہیں! تقویٰ کی لاتعداد منازل ہیں اور انسان تقویٰ کی جس منزل پر کھڑا ہو، اُس سے آگے کی منزل موجود ہے جس تک انسان تنہا قرآنی ہدایت وارشاد

کے ذریعے پہنچ سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ایک انسان چاہے کتنا بڑا متقی بھی کیوں نہ بن جائے، ہمیشہ قرآنی ہدایت وارشاد کا محتاج رہتا ہے اور ہدایت کا یہ سلسلہ کسی طور تحصیلِ حاصل نہیں ہے۔

باقی رہی چوتھی قسم، یعنی بے دین متقی تو اُس کے حوالے سے نقضِ غرض کا سوال درپیش ہے۔ کیونکہ ایسے شخص کے بارے میں یہ سوال درپیش ہے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کے بے دین ہوتے ہوئے بھی قرآنی ہدایت وارشاد اُس کے شاملِ حال ہو سکے؟ بھلا ایک بے دین انسان اہلِ تقویٰ ہو سکتا ہے کہ اُسے قرآن کا مطالعہ فائدہ پہنچا سکے اور وہ قرآن کی نور سے ہدایت پا سکے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص بے دین ہوتے ہوئے بھی متقی کہلائے۔ کیونکہ جو تقویٰ قرآن سے نورِ ہدایت پانے کی بنیادی شرط ہے، اس سے مراد ہر حال میں قبولِ دین اور روزہ و نماز وغیرہ جیسے تمام اصول و فروع کی پابندی نہیں، بلکہ بنیادی مرحلہ پر اُس سے مراد یہ ہے کہ انسان جس حال اور جس فکری سطح پر بھی کھڑا ہو، قرآن کریم کی اُن تعلیمات اور احکام کو قبول کرنے میں لیت و لعل سے کام نہ لے جو اس کی فطرت اور عقلی مسلّمات کے عین مطابق ہوں۔

بعبارت دیگر، قرآن سے نورِ ہدایت پانے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کی ان تعلیمات اور احکام پر کاربند ہو جن کے بنیادی، یقینی اور حتمی ہونے کی تائید اُس کی عقل و فطرت کر رہے ہوں۔ اگر ایک شخص ایسا کرے گا تو یقینا وہ اُس تقویٰ کا مالک کہلائے گا جو قرآن فہمی کی بنیادی شرط ہے۔ یہ انسان چاہے کافر ہو، چاہے مسلمان، قرآن ایسے شخص کو ہدایت کا سامان فراہم کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ قرآن کریم کا مطالعہ ایسے شخص کو تقویٰ کی اگلی منازل تک پہنچنے کی راہ پر لگا دیتا ہے خواہ ان منازل میں سے ایک منزل خود قبولِ اسلام اور شریعت کا پابند بننا ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر قرآن کا قاری مسلمان ہو تو وہ جس قدر اہلِ تقویٰ بن کر قرآن کی بارگاہ میں آئے گا اور جس قدر اپنی عقل و فطرت اور شریعت کے احکام کا پابند ہو گا، قرآن اُسی قدر اسے مزید نورِ ہدایت فراہم کرتے ہوئے، تقویٰ کی اگلی منازل پر پہنچا دے گا۔ اس کے برعکس، اگر قرآن کے قاری کے قلب میں یہ کیفیت حاکم ہو کہ وہ حق و حقیقت کی ہر بات ٹھکرانے پر بضد ہو، چاہے یہ بات اُس کی فطرت اور عقلی مسلّمات کے عین مطابق ہی کیوں نہ ہو تو یقینا ایسے شخص کے لئے قرآن کا مطالعہ بے سود ہے؛ چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ یقینا اُسے قرآن کے مطالعہ سے ہدایت نہیں، بلکہ ضلالت و گمراہی نصیب ہو گی۔

در حقیقت، قرآن کریم انسان سے اس کی سلیم فطرت اور عقلی مسلّمات کی بنیاد پر بات کرتا اور اُسے اس کی فطرت کی آواز پر کان دھرنے کی دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا ایک انسان جس قدر قرآن کی ان تعلیمات اور احکام کی پابندی کرتا جاتا ہے جنہیں وہ اپنی خالص عقل اور سلیم فطرت کے عین مطابق پاتا ہے تو وہ اتنا ہی متقی کہلاتا اور قرآن سے مزید نورِ ہدایت پانے کے لئے Qualify کرتا جاتا ہے۔ یہ ایک فطری اور نیچرل قانون ہے جس پر انسانی زندگی کے تمام شعبہ ہائے حیات کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ انسان زندگی کے کسی بھی شعبے میں اُس وقت قدم رکھ سکتا ہے جب وہ اس شعبہ میں داخل ہونے کی فطری استعداد کو بروئے کار لائے۔ یہ امر زندگی کے ہر شعبہ میں قدم رکھنے کی اساسی شرط ہے۔ لیکن جب انسان اس شرط پر پورا اترتے ہوئے کسی شعبہ میں قدم رکھتا ہے تو اس کا یہی اقدام، اُس کے اپنے شعبہ میں مزید آگے بڑھنے کا مقدمہ اور سرمایہ بن جاتا ہے اور اسے اپنے شعبہ میں ایسی ترقی ملنا شروع ہو جاتی ہے جو اس کی محنت و تلاش کا نتیجہ شمار ہوتی ہے۔ یوں انسان زندگی کے ہر شعبہ میں نیچے سے اوپر کے مراحل پر فائز ہوتا چلا جاتا ہے۔ مطالعہ قرآن اور قرآن سے نورِ ہدایت پانے کی داستان بھی بعینہٖ زندگی کے تمام دیگر شعبوں میں آگے بڑھنے کی داستان ہے۔ اِس میں نہ کوئی تحصیلِ حاصل ہے اور نہ کوئی نقضِ غرض۔ اس لئے کہ انسان کے با تقویٰ یا بے تقویٰ ہونے کا بنیادی معیار، اس کی وہ قلبی حالت اور کیفیت ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے عقلی و فطری مسلّمات یا شریعت کے احکام کی اطاعت یا خلاف ورزی کرتا ہے۔ قرآن کے حلقۂ خطاب میں آنے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے عقلی و فطری اور تسلیم کردہ اصولوں کی مخالفت نہ کرے۔ اگر ایک انسان یہ طرزِ زندگی اپنا لے تو وہ متقی ہے اور اس پر قرآنی ہدایت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

تقویٰ، عقل و فطرت کی پیروی

مذکورہ بالا بحث کا مدعیٰ یہ ہے کہ تقویٰ کا دائرہ، دین داری کے دائرہ سے وسیع تر ہے۔ اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ تقویٰ یا بے تقوائی کا نہائی معیار، عقل و فطرت کے مسلّمات اور احکام کی اطاعت و عصیان ہے۔ لہٰذا اگر ایک انسان اپنی عقل و فطرت کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے قرآن کی بارگاہ میں زانوئے تلمذ تہ کرے، خواہ ہنوز اس نے توحید و رسالت کا اقرار نہ بھی کیا ہو تب بھی وہ تقویٰ کے لباس سے مزیّن ہے اور قرآن اُس پر اپنی ہدات و ارشاد کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اسی ہدایت و ارشاد کی روشنی میں یہ شخص توحید و رسالت کے اقرار کی منزل کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر ایک شخص توحید و رسالت

کا اقرار کرتے ہوئے اور بظاہر تقویٰ کے نصاب کو پورا کرتے ہوئے بھی قرآن کا قاری بن جائے لیکن اپنی عقل و فطرت اور مسلمہ دینی احکام کی پیروی نہ کرے تو ایسے مسلمان پر بھی قرآن اپنی ہدایت و ارشاد کا دروزاہ بند کر دیتا اور اُسے خسران اور گھاٹے کے ساحل پر اتار دیتا ہے۔

دراصل، تقویٰ اور بے تقوائی کا تعلق، انسانی عقل و فطرت کے احکام و مسلمات سے اتنا گہرا ہے کہ دین و شریعت کے احکام کی پیروی بھی تب تک خدا کی اطاعت اور تقویٰ قرار نہیں پا سکتی جب تک انسان کی فطرت اور عقل کی حجیّت کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں جب تک دین و شریعت کے احکام عقل و فطرت سے حجیّت کی سند کسب نہ کر لیں، ان کی اطاعت و عصیان کا کوئی معنی نہیں بنتا۔ اس کے برعکس، عقل و فطرت کی حجیّت ذاتی ہے۔ یعنی جس ذات نے انسان کی فطرت کا خمیر مایہ بنایا ہے اور اُسے عقل کا جوہر عطا فرمایا ہے، اُسی ذات نے حجیّت کو عقل و فطرت کا لاینفک لازمہ بنا دیا ہے۔ لہٰذا وہ ذات جب دین کی پابندی کا حکم دیتی ہے تو فطرت کے میثاق کو اس حکم کی اساس بناتی ہے اور بنی نوعِ بشر کے سامنے اطاعت و عصیان اور ثواب و عقاب کا معاملہ رکھتی ہے تو اِسے انسان کے اپنے عقلی مسلمات کی بنیاد پر استوار فرماتی ہے۔ دین کی پابندی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کی جڑیں انسانی فطرت میں خوابیدہ ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (الروم: ۳۰) یعنی: "پس اپنا رخ اس دین کی طرف کر لیں جو سیدھا اور اللہ کی بنائی ہوئی وہ فطرت ہے جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا فرمایا ہے۔" اسی طرح اطاعت و عصیان اور ثواب و عقاب کی داستان کا دارومدار عقل کی حجیّت پر ہے۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے یہ روایت نقل ہوئی ہے: قال: لما خلق الله العقل استنطقه ثم قال له: أقبل فأقبل ثم قال له: أدبر فأدبر ثم قال: وعزّتي وجلالي ما خلقت خلقا هو أحبّ إلي منك ولا أكملتك إلا فيمن أحبّ، أما إنّي إياك آمر و إياك أنهى وإياك أعاقب و إياك أثيب. (1) یعنی: "آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: جب اللہ (عزّوجلّ) نے عقل کو خلق فرمایا تو اسے بلوایا اور حکم دیا: "آگے آؤ!" تو عقل (نے اطاعت کی اور) آگے بڑھی۔ پھر اسے حکم دیا: "پیچھے ہٹو!" تو عقل (نے اطاعت کی اور) پیچھے ہٹی۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مجھے میری عزّت و جلال کی قسم! میں نے کوئی ایسی مخلوق خلق

نہیں کی جو مجھے تجھ سے زیادہ محبوب ہو اور میں نے تجھے اپنے محبوب افراد کے علاوہ کسی میں کامل نہیں کیا۔ پس میں تجھے امر کروں گا اور تجھے نہی کروں گا اور تجھے عقاب دوں گا اور تجھے ثواب دوں گا۔"

نتیجہ یہ کہ تقویٰ اور بے تقوائی کا دائرہ کار، محض دینداری کے دائرہ کار تک محدود نہیں، بلکہ وسیع تر ہے۔ اس امر کی ایک اور زاویے سے وضاحت یہ ہے کہ انسان کے اچھائی اور برائی کے تمام فیصلے اور نیک و بد کے تمام احکام دو طرح کے ہیں:

1. وہ احکام جن کے صادر کرنے میں انسان کی فطرت اور عقل خود کفیل ہیں اور اُسے ان احکام کے دریافت کرنے یا صادر کرنے میں کسی بیرونی ہدایت و ارشاد کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے احکام کو علمی اصطلاح میں "مستقلات عقلیہ" کا نام دیا جاتا ہے۔
2. وہ احکام جن کے صادر کرنے میں انسان کی عقل خود کفیل نہیں اور اُن تک پہنچ کے لئے اُسے بیرونی ہدایت وارشاد اور وحی و پیغمبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان احکام کو "غیر مستقلات عقلیہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ اصول فقہ کی کتب میں علمائے علم اصول فقہ نے مستقلات و غیر مستقلات عقلیہ پر تفصیلی مباحث پیش کی ہیں۔ متاخرین میں سے معروف مجتہد، استاد محمد رضا المظفر نے "غیر مستقلات عقلیہ" کی جو تعریف بیان کی ہے، اُسی سے "مستقلات عقلیہ" کی تعریف بھی قابل فہم ہے۔ اُن کا کہنا ہے: **إن المراد من "غير المستقلات العقلية" هو مالم يستقل العقل به وحده في الوصول إلى النتيجة، بل يستعين بحكم شرعي في إحدى مقدمتي القياس (وهي الصغرى) والمقدمة الأخرى (وهي الكبرى) الحكم العقلي**(2) یعنی: "غیر مستقلات عقلیہ وہ ہیں جن میں نتیجہ تک وصول میں عقل اکیلی کافی نہ ہو، بلکہ قیاس کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ یعنی صغریٰ میں عقل شریعت کے حکم سے مدد لے اور دوسرا مقدمہ یعنی کبریٰ عقلی حکم ہو۔"

احکام کی اسی تقسیم کے تناظر میں علمائے دین نے شریعت کے احکام کو بھی دو قسموں میں تقسیم کیا ہے:

1. "تسدیدی" یا "ارشادی" احکام؛ یعنی شریعت کے وہ احکام جن کا شریعت کے آنے سے پہلے انسانی فطرت تقاضا کرتی ہو اور انسانی عقل اُن کی صحت اور درستی پر مہرِ تائید ثبت کر چکی ہو۔ مثال کے طور انسانی فطرت کا ہمیشگی حکم ہے کہ اپنی بقاء کے لئے تگ و دَو کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یہ

حکم انسانی فطرت کا حکم ہے جو کافر و مومن سب کے لئے یکساں ہے۔ اب اگر یہاں "وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرۃ: ۱۹۵۔ یعنی: "اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو") کا حکم آ جائے تو شریعت کا یہ حکم، تسدیدی یا ارشادی حکم کہلائے گا۔

2. "مولوی" یا "تاسیسی" احکام؛ یعنی شریعت کے وہ احکام جن کو انسانی عقل و فطرت، وحی و شریعت کی رہنمائی کے بغیر کشف نہ کر سکے۔ مثال کے طور پر انسان اپنی عقل کے ذریعے یہ کشف کرنے سے عاجز ہے کہ نماز کتنی رکعات اور کن اذکار پر مشتمل ہونی چاہیے۔ کس وقت پر کتنی رکعت نماز ادا کرنا ہے اور نماز کی ادائیگی کا طریقہ کار کیا ہے؟ لہٰذا اس معاملے میں شریعت کا جو حکم ہماری رہنمائی کرتا ہے اُسے "مولوی" یا "تاسیسی" حکم کہا جاتا ہے۔

لیکن اِس میں کوئی فرق نہیں کہ حکم "تسدیدی" اور "ارشادی" ہو، یا "مولوی" اور "تاسیسی"، بہر صورت، انسان جب اُس حکم کی اطاعت کرتا ہے جس کی تائید اُس کی عقل و فطرت سے ہو چکی ہے تو وہ اہلِ تقویٰ ہے اور جب وہ اُس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ بے تقویٰ اور فاسق شمار ہوتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں اگر ایک شخص قرآن کریم کے ان احکام کی اطاعت کرے جو اُس کی طینت اور عقلی مسلمات کے مطابق ہوں (ارشادی احکام) تو یہ انسان جب بھی قرآن کی بارگاہ میں زانوئے تلمذ تہہ کرے گا قرآن ضرور اُس پر اپنی ہدایت و ارشاد کے دروازے کھول دے گا اور اُسے وہ کچھ سمجھ آنے لگے گا جس تک اب تک اس کی عقل کو رسائی حاصل نہ تھی۔ اس کے برعکس، اگر انسان اپنی عقل کے "ارشادی" احکام کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ بے تقویٰ اور فاسق شمار ہو گا اور ایسا شخص جب قرآن کا مطالعہ کرے گا تو اُس کی گمراہی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (البقرۃ: ۲۶) یعنی: "اللہ اِس کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ ٹھہراتا اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور اس سے صرف انہی کو گمراہی میں ڈالتا ہے جو (پہلے ہی) نافرمان ہیں۔"

تقویٰ اور بے تقوائی کی اس تفسیر کی مزید وضاحت یہ ہے کہ جب انسانی عقل و فطرت یہ حکم صادر کر دیتے ہیں کہ انسان پر اپنی بقاء کے لئے تگ و دَو کرنا ضروری ہے اور ایک عقل مند انسان کے لئے مضرِ صحت اشیاء کا استعمال انسان کو ہلاکت میں ڈالنے کا موجب ہے تو جو شخص مضرِ صحت اشیاء کے استعمال سے بچتا ہے تو وہ قلبِ

سلیم کا مالک اور متقی ہے اور جو عقل و فطرت کے احکام کو پامال کرتے ہوئے ان اشیاء کو استعمال کرتا ہے تو اُس کا دل مریض اور وہ بے تقوا اور فاسق ہے۔ اس تناظر میں قلبِ سلیم کا مالک ہونے کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اگر ایک انسان کی عقل کے مطابق یہ احتمال بھی پایا جاتا ہو کہ قرآن کریم، فرزند عبد اللہ ﷺ کا من گھڑت افسانہ نہیں ہو سکتا اور قرآنی آیات پر کان دھرنا چاہیے اور وہ اس احتمال پر قرآن کی آیات پر غور فکر کرے اور دل کی اُن تمام آوازوں پر کان نہ دھرے جو اسے بے بندو باری کی دعوت دی رہی ہوں تو ایسا شخص قلب سلیم کا مالک کہلائے گا۔ یقینا ایسے شخص کے لئے قرآن کریم ہدایت کی کتاب بن جاتا ہے اور پھر قرآنی ہدایت کی روشنی میں انسان جوں جوں تقویٰ کی اگلی منازل پر فائز ہوتا چلا جاتا ہے، اس کے لئے قرآنی ہدایت کے اگلے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وحی و نبوّت کے اقرار کی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور اگر وہ اس منزل پر پہنچا ہوا ہے تو تقویٰ کی اگلی منزلوں پر فائز ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کے برعکس، اگر ایک شخص سے اس کی عقل تو یہ کہہ رہی ہو کہ یہ عین ممکن ہے کہ فرزند عبداللہ، اللہ کے نبی ہوں اور قرآن ان کا کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہو لیکن یہ شخص ہوا و ہوس اور باطل تمایلات کی بنا پر اپنی عقل کے اس حکم کی مخالفت کرے تو ایسا شخص کا دل مریض اور بے تقویٰ ہے اور اُسے قرآن کا مطالعہ ہدایت کا نور عطا نہیں کر سکتا۔ پس تقویٰ اور بے تقوائی کا دار و مدار تنہا "مولوی" یا "تاسیسی" احکام کی پیروری پر نہیں کہ اگر ایک شخص تک مولوی احکام نہ پہنچے ہوں تو یہ کہا جائے کہ وہ اہلِ تقویٰ نہیں ہو سکتا اور نتیجتاً قرآن سے نورِ ہدایت نہیں پا سکتا۔ نہیں، ایسا نہیں؛ بلکہ ایک شخص کا اپنی عقل و فطرت کے مسلّمات کی پیروی کرنا، وہ تقویٰ ہے جو قرآن سے نورِ ہدایت پانے کی بنیادی شرط (Pre-condition) ہے۔

بنابریں، اگر ایک شخص اس معنی میں متقی ہو، خواہ وہ ابھی دین کے دائرہ میں داخل نہ بھی ہوا ہو اور وہ قرآن کی بارگاہ میں زانوئے تلمذ تہ کرے تو یقینا اُسے قرآن کریم سے نورِ ہدایت مل سکتا ہ جس کے نتیجے میں وہ دینداری کے دائرہ میں داخل ہوتے ہوئے ہدایت کے راستوں میں مزید گامزن ہو سکتا ہے اور یوں قرآن کریم کے نزول کی غرض کے نقض کا اشکال بھی برطرف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ تقویٰ جو قرآن کریم سے نورِ ہدایت پانے کی شرط ہے، تقویٰ کا ایک مرتبہ ہے اور وہ تقویٰ جو مطالعہ قرآن کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے وہ تقویٰ کا دوسرا مرتبہ ہے تو اِس سے "تحصیلِ حاصل" کا اشکال و اعتراض بھی رفع ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم کے عمومی خطابات

اس دعویٰ کی ایک اور دلیل کہ قرآنی ہدایت وارشاد فقط اہل صوم وصلاۃ اور حج وزکات تک محدود نہیں، بلکہ یہ ایک فیضِ عام ہے جس سے ہر منصف مزاج، حقیقت پسند بے دین بھی فیضیاب ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنے متعدد خطابات میں پوری انسانیّت سے خطاب فرمایا ہے۔ اگر قرآن محض دیندار، اہلِ تقویٰ کے لئے ہدایت کا سامان فراہم کرنے کے لئے نازل ہوا ہوتا تو پوری انسانیّت کو اپنا مخاطب قرار نہ دیتا۔ حالانکہ قرآن کریم نے لگ بھگ ۲۷ آیات میں "يَا أَيُّهَا النَّاسُ" کے خطاب کے ذریعے پوری انسانیّت سے خطاب فرمایا ہے اور یقینا یہ خطاب انسانیّت کی ہدایت وارشاد کی غرض وغایت سے ہوا ہے۔ لہٰذا یہ قرآنی خطابات بذات خود اس امر کی دلیل ہیں کہ قرآنی ہدایت وارشاد کا دروازہ محض دیندار متقی افراد کے لئے نہیں، بلکہ ہر منصف مزاج، حقیقت پسند انسان کے لئے کھلا ہے۔ پس قرآنی ہدایت وارشاد کو محض اہلِ صوم وصلاۃ وحج وزکات تک محدود کرنا اور قرآن کریم پر نقضِ غرض کا اشکال بے جا ہے۔

مفسرین کی آراء کا طائرانہ جائزہ

اگر ہم نقضِ غرض اور تحصیلِ حاصل کے اشکالات کے معاملہ میں مفسرین کی آراء کا طائرانہ جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ سب مفسرین نے اس مسئلہ پر بحث نہیں کی تاہم عمدہ مفسرین اس اشکال کی طرف متوجہ تھے اور انہوں نے اپنی اپنی تفاسیر میں "تحصیلِ حاصل یا نقضِ غرض" کے اشکال کا صریحا یا تلویحا جواب دیا ہے۔ ذیل میں ہم اجمالی طور پر چند مفسرین کی آراء کا جائزہ لیں گے۔

قدماء میں سے ابو جعفر محمد بن جریر الطبری، متوفی ۳۱۰ھ نے اس مسئلہ پر توجہ دی ہے لیکن انہوں نے اس بحث کو اجاگر نہیں کیا۔ طبری نے اپنی تفسیر جامع البیان میں " هدى للمتقين " کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں تقویٰ سے اُس کا عام معنی مراد لینا چاہیے۔ کیونکہ یہاں تقویٰ سے اس کا خاص معنی مراد ہوتا تو اللہ تعالیٰ اُسے بیان کرتا۔ حالانکہ ایسا بیان نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں: فليس لأحد من الناس أن يحصر معنى ذلك على وصفهم بشئ من تقوى الله عز وجل دون شئ إلا بحجة يجب التسليم لها ۔۔۔ فقد

تبين إذا بذلك فساد قول من زعم أن تأويل ذلك إنما هو : الذين اتقوا الشرك وبرأوا من النفاق لأنه قد يكون كذلك وهو فاسق غير مستحق أن يكون من المتقين۔ (3)

یعنی: "کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ہدی للمتقین میں تقویٰ کو تقوائے الٰہی کے کسی خاص معنی پر حمل کرے اور دوسرے معنی کی نفی کرے؛ مگر یہ کہ اس کے پاس کوئی ایسی دلیل ہو جسے تسلیم کرنا واجب ہو۔۔۔ لہٰذا یہ واضح ہوا کہ جن لوگوں نے متقین کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک سے بچتے اور نفاق سے برائت طلب کرتے ہیں، یہ تاویل نادرست ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایک شخص نہ مشرک ہوتا ہے، نہ منافق، لیکن اس کے باوجود وہ فاسق ہوتا ہے اور متقین میں شمار ہونے کا مستحق نہیں ہوتا۔"

طبری کی ان عبارات سے واضح ہے کہ اُن کے ذہن میں وہ مباحث اور سوالات جنم لے رہے ہیں جن پر ہم نے تفصیل سے بحث کی ہے لیکن وہ اس مسئلہ کو پوری طرح سلجھا نہیں سکے۔

مرحوم طبری کے بعد شیخ طوسی نے بھی اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ وہ " هدى للمتقين "کے ضمن میں لکھتے ہیں: إنما خص المتقين بذلك وإن كان هدى لغيرهم من حيث إنهم هم الذين اهتدوا به وانتفعوا به كما قال: " إنما تنذر من اتبع الذكر " وإن كان انذر من لم يتبع الذكر(4)

یعنی: "اس کے باوجود کہ قرآن دوسروں کے لئے بھی ہدایت کا سامان ہے، یہاں اس کی ہدایت کو متقین کے ساتھ اس لئے مختص کیا گیا ہے کیونکہ یہ متقی افراد ہی ہیں جو قرآن سے ہدایت اور نفع حاصل کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: " آپ تو صرف اسی شخص کو ڈراتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرتا ہے" حالانکہ جن لوگوں نے آپ کی نصیحت کی پیروی نہ کی آپ ﷺ ان کو بھی ڈرانے والے تو ہیں۔"

شیخ طوسی نے اس بحث کو اس سے زیادہ نہیں کھولا۔ تاہم ان کا اندازِ گفتگو بتاتا ہے کہ اُن کے ذہن میں بھی وہ سوالات و اشکالات موجود ہیں جن پر اس مقالہ میں تفصیلی بحث پیش کی گئی ہے۔

شیخ طوسی کے بعد جن مفسرین نے اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی ہے ان میں مرحوم طبرسی کا نام قابل ذکر ہے۔ شیخ طبرسی نے اپنی تفسیر جوامع الجامع میں انتہائی اختصار کے ساتھ اس مسئلہ پر بات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: والمتقي في الشريعة هو الذي يقي نفسه تعاطي ما يستحق به العقاب من فعل أو ترك ، وسماهم عند مشارفتهم لاكتساء لباس التقوى متقين ، كقول النبي (صلى الله عليه وآله) : "

من قتل قتيلا فله سلبه " وقوله تعالى : (ولا يلدوا إلا فاجرا كفارا) أي : صائرا إلى الفجور والكفر، فكأنه قال : هدى للصائرين إلى التقى (5) یعنی: "شریعت میں متقی سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو اُس فعل و ترک سے بچاتا ہے جس کی بنیاد پر وہ عقاب کا مستحق ٹھہرے۔ اور قرآن کریم کا اپنے مخاطبین کو تقویٰ کا لباس پہننے کے لئے آمادگی کے مرحلہ پر متقین کا نام دینا، ویسا ہی ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ: " جس نے قتیل کو قتل کیا تو اسے بھی اس کو سولی پر لٹکانے کا حق حاصل ہے۔" یا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وہ نہیں جنم دیں گے مگر فاجر و کافر کو۔" یعنی ایسے لوگوں کو جو فجور و کفر کا راستہ اپنائیں گے۔ پس گویا کہ یہاں قرآن نے یہ کہا ہے کہ: "یہ کتاب ہدایت ہے اُن لوگوں کے لئے جو تقویٰ کو اپنی منزل قرار دیں گے۔"

جیسا کہ مرحوم طبرسی کی عبارات سے واضح ہے، انہوں نے اپنے اسلاف سے کافی بہتر اور دقیق تر اس مسئلہ کو اجاگر کیا ہے۔ گویا وہ یہاں متقین سے مراد فقط اہل دین اور صوم وصلاۃ وحج وزکات کے پابند مراد نہیں لے رہے، بلکہ اُن تمام افراد کو علم ادبیات کی اصطلاحات کی روشنی میں "علاقۂ عود" کی بنیاد پر متقی قرار دے رہے ہیں جو اگرچہ ابھی ہدایت کے راستے پر گامزن نہیں ہوئے لیکن وہ اپنی سلیم فطرت، حقیقت پسندی اور منصف مزاجی کے طفیل عنقریب اِس راستے پر لگنے والے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اگر شیخ طبرسی کے اس بیان کو درست مان لیا جائے تو قرآن فہمی کے لئے تقویٰ کی شرط کا اصول، ایک تسلیم شدہ اصول باقی رہتا ہے اور قرآن پر نقضِ غرض کا اشکال بھی وارد نہیں ہوتا۔

مفسرین میں سے امام رازی نے نہ فقط نقضِ غرض کے اشکال پر، بلکہ تحصیلِ حاصل کے اشکال پر بھی توجہ دی ہے۔ انہوں نے "هدى للمتقين " کی تفسیر میں جو سوالات اٹھائے ہیں ان میں پہلا سوال یہی ہے کہ: السؤال الأول : كون الشيء هدى ودليلا لا يختلف بحسب شخص دون شخص، فلماذا جعل القرآن هدى للمتقين فقط؟ وأيضا فالمتقي مهتدي، والمهتدي لا يهتدي ثانيا والقرآن لا يكون هدى للمتقين یعنی: "پہلا سوال یہ ہے کہ کسی چیز کے ہدایت اور دلیل ہونے میں اشخاص کے اختلاف سے کوئی اختلاف رُخ نہیں دیتا۔ اور جب ایسا ہے تو پس قرآن کو محض

متقین کے لئے ہدایت کیوں قرار دیا گیا ہے؟ نیز، متقی تو ہدایت یافتہ ہوتا ہے اور جو ہدایت یافتہ ہو اُسے دوبارہ ہدایت نہیں کی جاتی تو قرآن متقین کے لئے کیسے ہدایت بن سکتا ہے؟"

یہ سوال اٹھانے کے بعد امام رازی نے قرآن کو کافرین کے لئے بھی ہدایت قرار دیا ہے۔ ان کے بقول: القرآن كما أنه هدى للمتقين ودلالة لهم على وجود الصانع ، وعلى دينه وصدق رسوله ، فهو أيضا دلالة للكافرين. إلا أن الله تعالى ذكر المتقين مدحا ليبين أنهم هم الذين اهتدوا وانتفعوا به(6) یعنی: "قرآن جس طرح کہ متقین کے لئے ہدایت اور ان کے لئے صانع کے وجود پر، اس کے دین اور اس کے رسول کی صداقت پر دلیل ہے، اسی طرح کافرین کے لئے بھی رہنما ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں متقین کی مدح میں اُن کا تذکرہ اس لئے کیا ہے تاکہ واضح کر دے کہ یہ اہل تقویٰ ہی ہیں جو قرآن سے نورِ ہدایت پاتے اور اُسے سے نفع اندوز ہوتے ہیں۔"

قدماء مفسرین میں سے ابن عربی نے اپنی تفسیر میں "تحصیلِ حاصل" کے اشکال کا جواب دیا ہے، لیکن "نقضِ غرض" کے اشکال کا جواب نہیں دیا۔ اُن کے مطابق انسانوں کی بنیادی طور پر دو قسمیں یعنی اشقیاء اور سعداء ہیں۔ پھر اشقیاء کی ایک قسم مطرودین اور دوسری منافقین ہے اور اشقیاء کے یہ دونوں گروہ قرآنی ہدایت و ارشاد سے محروم ہیں۔ ابن عربی کی عین عبارت یہ ہے: "فالقرآن ليس هدى للفريق الأول من الأشقياء لامتناع قبولهم للهداية لعدم استعدادهم، ولا للثاني لزوال استعدادهم ومسخهم وطمسهم بالكلية بفساد اعتقادهم(7) یعنی: "قرآن اشقیاء کے پہلے گروہ کے لئے ہدایت نہیں ہے کیونکہ ان میں استعداد ہی نہیں اور وہ قرآنی ہدایت قبول ہی نہیں کر سکتے۔ اور قرآن اشقیاء کے دوسرے گروہ کے لئے بھی ہدایت نہیں ہے کیونکہ ان کی استعداد اُن کے فاسد عقیدے کی وجہ سے مکمل طور پر زائل، مسخ اور نابود ہو چکی ہے۔"

بنابریں، ابن عربی نقضِ غرض کے اشکال کا جواب نہیں دیتا۔ جہاں تک تحصیلِ حاصل کے اشکال کا تعلق ہے تو اگرچہ ابن عربی نے اس اشکال کو بھی صریحا بیان نہیں کیا تاہم اس نے متقین کی پانچ اقسام بیان کی ہیں اور ان کے مطابق یہ پانچوں اقسام کسی نہ کسی طرح قرآنی ہدایت و ارشاد کی محتاج بھی ہیں اور قرآن

ان کے لئے ہدایت کا سامان بھی ہے: "فبقي هدى للخمسة الأخيرة الذين يشملهم المتقون یعنی: "قرآن آخری پانچوں اقسام کے لئے ہدایت ہے جو متقین کے زمرے میں شامل ہیں۔"

البتہ آگے چل کر ابن عربی نے ایک ایسی بات کہی ہے جس سے نقضِ غرض کے اشکال کے اُس جواب کی ایک جھلک سامنے آتی ہے جو ہم پیش کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: فعلى هذا، المتقون في هذا الموضع هم المستعدون الذين بقوا على فطرتهم الأصلية، واجتنبوا رين الشرك والشك لصفاء قلوبهم وزكاء نفوسهم، وبقاء نورهم الفطري، فلم ينقضوا عهد الله . وهذه التقوى مقدمة على الإيمان، ولها مراتب أخرى متأخرة عنه كما سيأتي إن شاء الله. (8)

یعنی: "بنابریں، اس مقام پر متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں استعداد پائی جاتی ہے اور وہ اپنی اسلی فطرت پر باقی ہیں اور وہ اپنے دلوں کی پاکیزگی، نفوس کی طہارت اور اپنے فطری نور کی بقاء کی وجہ سے شرک اور شک کے زنگ سے آلودہ نہیں ہوئے۔ پس انہوں نے اللہ کے عہد کو نہیں توڑا۔ اور یہ تقویٰ ایمان پر مقدم ہے اور جیسا کہ ان شاء اللہ عنقریب بیان ہوگا تقویٰ کے دیگر مراتب بھی ہیں جو اس مرتبہ کے بعد آتے ہیں۔"

اگر ابن عربی کی آخری عبارت پر خوب توجہ دی جائے تو اِس میں جہاں نقضِ غرض کے اشکال کا جواب تلویحا موجود ہے وہاں تحصیلِ حاصل کے اشکال کا جواب بھی انتہائی ایجاز کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن اس مقام پر بطور کلی ابن عربی کے بیان میں ایک طرح کا اضطراب نظر آتا ہے۔

جن مفسرین نے اس اشکال پر توجہ دی ہے ان میں ایک ابن کثیر ہے۔ ابن کثیر نے نقضِ غرض کے اشکال کو جواب بہت مبہم انداز میں دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ: وخصت الهداية للمتقين كما قال۔۔۔ من الآيات الدالة على اختصاص المؤمنين بالنفع بالقرآن لأنه هو في نفسه هدى ولكن لا يناله إلا الأبرار" (9) یعنی: "ہدایت کو متقین کے ساتھ مختص کر دیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے۔۔۔ وہ آیات جو فقط مومنین کو قرآن سے نفع اندوز وتا قرار دیتی ہیں۔ کیونکہ قرآن اپنی ذات میں ہدایت ہی ہے لیکن اس کی ہدایت محض نیکوکاروں کو ہی حاصل ہوتی ہے۔"

اسی طرح ابن کثیر نے تحصیلِ حاصل کے اشکال کا جواب بھی تلویحا اور ایک روایت کے ضمن میں دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے: وقد روى الترمذي وابن ماجة من رواية أبي عقيل عبد الله بن عقيل عن

عبد الله بن يزيد عن ربيعة بن يزيد وعطية بن قيس عن عطية السعدي قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم " لا يبلغ العبد أن يكون من المتقين حتى يدع ما لا بأس به حذرا مما به بأس " (10) یعنی: "ترمذی اور ابن ماجہ نے ابو عقیل عبد اللہ ابن عقیل بن عبد اللہ۔۔۔ نے عطیہ السعدی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بندہ اُس وقت تک متقین کے زمرے میں شامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُن امور کے خوف سے جن کی انجام دہی میں کوتاہی ہے، ایسے امور کی انجام دہی کو بھی ترک کر دے جن کے انجام دینے میں کوتاہی نہ ہو۔"

اگرچہ جلال الدین سیوطی نے بھی اپنی تفسیر میں مذکورہ بالا روایت کو نقل کیا ہے لیکن اس کی توجہ نقضِ غرض یا تحصیلِ حاصل کے اشکال کی طرف نہیں ہے اور نہ ہی وہ ان اشکالات کی جواب دہی کے درپے ہوا ہے۔ (11) سیوطی کے برعکس، فیض کاشانی نے اس معاملہ کو انتہائی ایجاز کے ساتھ سہی، لیکن اٹھایا ہے۔ ان کا لکھنا ہے: أقول: وإنما خص المتقين بالاهتداء به لأنهم المنتفعون به وذلك لأن التقوى شرط في تحصيل المعرفة الحقة (12). یعنی: "میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے فقط متقین کو قرآنی ہدایت کے ساتھ اس لئے مختص کیا ہے کیونکہ یہ متقین ہی ہیں جو قرآنی ہدایت سے نفع اندوز ہوتے ہیں اور ایسا اس لئے ہے کیونکہ تقویٰ معرفت حقہ کے حصول کی شرط ہے۔"

متاخر مفسرین میں سے علامہ محمد حسین طباطبائی نے اس معاملہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ تقویٰ کوئی ایک ٹھوس حقیقت نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی صفت ہے جو ایمان کے تمام مراتب کے ساتھ قابلِ جمع ہے۔ (13) گویا قرآن کے متقین کے لئے ہدایت کا سامان ہونے سے تحصیلِ حاصل کا اشکال پیش نہیں آتا۔ اور جہاں تک ہدایت کا تعلق ہے تو علامہ طباطبائی کے مطابق ہدایت دو طرح کی ہے۔ ایک تقویٰ کے لباس سے ملبس ہونے سے قبل کی ہدایت اور دوسری تقویٰ کے لباس سے ملبس ہونے کے بعد کی ہدایت: ثم إن الهداية الثانية لما كانت بالقرآن، فالهداية الأولى قبل القرآن وبسبب سلامة الفطرة (14) یعنی: "چونکہ دوسری ہدایت، قرآن کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، پس پہلی ہدایت قرآن سے پہلے اور سلیم فطرت کے طفیل ہے۔"

علامہ کے مطابق سلیم الفطرت انسان اپنے آپ کو غیر کا محتاج سمجھتا، اُس غیر کی تلاش میں نکلتا اور خدا تک پہنچتا اور غیب پر ایمان لے آتا ہے۔ یہاں سے دوسری ہدایت جو بعد القرآن ہے، اُس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ دوسری ہدایت، پہلی ہدایت، یعنی فطرت کی ہدایت کی فرع ہے: ومن الدليل على أن هذه الهداية الثانية من الله سبحانه فرع الأولى ، آيات كثيرة كقوله تعالى: (يثبت الله الذين آمنوا بالقول الثابت في الحياة الدنيا وفي الآخرة) . . . إلى غير ذلك من الآيات (15) یعنی: "اس دعویٰ کی دلیل کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسری ہدایت، پہلی ہدایت کی فرع ہے، بہت سی آیات ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان: " اللہ ایمان والوں کو ثابت بات کی وجہ سے دنیوی زندگی میں بھی ثابت قدم رکھتا ہے اور آخرت میں بھی۔"۔۔۔اور ان کے علاوہ دیگر آیات۔"

دل، سرمایۂ ہدایت وارشاد

اب تک کی بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے مطالعہ کا ایک اساسی اصول، اہلِ تقویٰ اور قلبِ سلیم کا مالک ہونا ہے۔ جس شخص کے پاس یہ دل نہ ہو، اُس کے پاس ہدایت پانے اور کمال کی منزلیں طے کرنے کا سرمایہ ہی نہیں ہے۔ یقیناً ایسا شخص چاہے کتنا بڑا دانش مند، فلسفی اور اہلِ دقّت و نظر ہی کیوں نہ ہو، آسمانی ہدایت وارشاد سے بے بہرہ رہتا ہے۔ اس حوالے سے استاد شہید مرتضیٰ مطہری لکھتے ہیں: "قرآن جہاں وحی کی بات کرتا ہے وہاں عقل کا نام تک نہیں لیتا، بلکہ اس کا سروکار فقط قلب پیغمبر سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن پیغمبر کو عقل واستدلال کی طاقت سے نہیں ملا، بلکہ یہ پیغمبر کا قلب ہے جو ایسی حالت پر پہنچا ہے جس میں اس کے اندر متعالی حقائق کے درک وشہود کی استعداد پیدا ہوئی ہے۔ سورہ نجم اور تکویر (1) کی آیات اس ارتباط کی کیفیت کو ایک حد تک آشکار کرتی ہیں۔ قرآن یہ باتیں اس لئے کرتا ہے تاکہ بتا دے کہ ان مسائل کی حدود عقل کی حدود سے بالاتر ہیں۔"(16)

---

[1] ۔النجم: ۱۱-۱۴: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ عِندَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَىٰ یعنی: "اُن کے دل نے اُس کی تردید نہ کی جو اُن کی آنکھوں نے دیکھا۔ آیا تم ان سے اِس پر جھگڑتے ہو کہ جو انہوں نے دیکھا۔ کیا تم ان سے اِس پر جھگڑتے ہو کہ جو انہوں نے دیکھا؟ اور بے شک انہوں نے سدرۃ المنتہیٰ کے قریب دوسری مرتبہ دیکھا ۔اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ یعنی: "اور بے شک انہوں نے اس کو روشن کنارے پر دیکھا۔" (التکویر: ۲۳)

حوالہ جات

1۔الکلینی، الکافی؛ ج1، ص10

2 ۔الشیخ محمد رضا المظفر؛اصول الفقہ، موسسۃ النشر الاسلامی التابعہ لجامعۃ المدرسین بقم المقدسۃ، ج2؛ص ۳۰۰۔

3 ۔الطبری، ابو جعفر محمد بن جریر؛ متوفی ۳۱۰ھ؛ جامع البیان، دار الفکر للطباعہ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان۔ ۱۹۹۵ء۔ ج۱۔، ص ۱۴۸۔

4 ۔الطوسی؛ابو جعفر محمد ابن الحسن، متوفی ۴۶۰ھ؛التبیان، مکتب الاعلام الاسلامی، ۱۴۰۹ھ؛ج۱، ص ۵۳۔

5 ۔الفضل ابن الحسن، الطبرسی، متوفی ۵۴۸ھ، جوامع الجامع؛ موسسۃ النشر الاسلامی، التابعۃ لجامعۃ المدرسین۔۱۴۱۸ھ، ج۱، صص ۶۳-۶۴۔

6 ۔الرازی، متوفی ۶۰۶ھ تفسیر الرازی، ج۲۔ص ۲۱۔بی تا۔بی جا۔

7 ۔ابن العربی، متوفی ۶۳۸ھ، تفسیر ابن عربی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، چاپ ۲۰۰۱، م۔ج۱، صص ۳۲-۳۳۔

8 ۔ایضا۔

9 ۔ابو الفداء، اسماعیل ابن کثیر، متوفی، ۷۷۴ھ؛ تفسیر ابن الکثیر، ۱۹۹۲، دار المعرفہ للطباعہ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان۔ج۱، ص ۴۲۔

10 ۔ایضا۔

11 ۔السیوطی، جلال الدین، متوفی ۹۱۱؛ الدر المنثور، دار المعرفہ للطباعۃ والنشر، بیروت، لبنان، ج۱، ص ۲۴۔

12 ۔الکاشانی، الفیض، متوفی ۱۰۹۱؛ھ، تفسیر الصافی، مرکز النشر التابع لمکتب الاعلام الاسلامی، ج۱، ص ۹۲۔

13 ۔محمد حسین الطباطبائی، متوفی ۱۴۰۱۲ھ۔ المیزان فی تفسیر القرآن، منشورات جامعۃ المدرسین، فی الحوزۃ العلمیۃ، قم المقدسہ۔ج۱، ص ۴۳۔

14 ۔ایضا، ص ۴۴۔

15 ۔ایضا، ص ۴۵۔

16۔ مرتضی، مطہری، آشنائی باقرآن، جلد اول، ص ۱۳۸؛ بحوالہ:

http://shahrudi.parsiblog.com/Posts/351.

تفسیر بالرائے اور تفسیر عقلی میں فرق

نذر حافی*
nazarhaffi@gmail.com

کلیدی کلمات: تفسیر عقلی، تفسیر بالرائے، علوم، برہان، استدلال، منطق، فلسفہ، شعور، تمثیل، معرفت

خلاصہ

قرآن مجید کا درست فہم ہر زمانے کے بشر کی بنیادی ضرورت ہے۔ قرآن مجید کا علم حُسنِ ذاتی رکھتا ہے، اگر کوئی صرف قرآن مجید کو حفظ ہی کرلے تو تب بھی اسے معاشرے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے اس مقام و منزلت سے بعض لوگ سوئے استفادہ کرتے ہوئے اس کی آیات کی تفسیر بالرائے کرتے ہیں۔

عوام کی اکثریت چونکہ علم دین کے فہمِ عمیق سے ناآشنا ہوتی ہے بعض شعبدہ باز لہٰذا قرآن مجید میں معنوی تحریف کرتے ہوئے مرادِ خداوندی کو بیان کرنے کے بجائے اپنے مفروضات بیان کرتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ تفسیر کا ہدف مقصود پروردگار کو کشف کرنا ہے نہ کہ اپنے من گھڑت مفروضات کو قرآن مجید سے ثابت کرنا۔

تفسیر بالرائے کو روکنے کے لئے عوامی شعور کو بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک عوام تفسیر کے مفہوم، اہمیت، اقسام اور مبانی و قواعد کو نہیں سمجھیں گے تب تک تفسیر بالرائے کو نہیں روکا جا سکتا۔ یاد رہے کہ عام طور پر لوگوں کے سامنے تفسیر بالرائے کو تفسیر عقلی کہہ کر بیان کیا جاتا ہے جس سے عام عوام دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ تفسیر قرآن کے لئے مخصوص علوم و فنون کی ضرورت ہے۔ انہی علوم فنون کی وجہ سے ہی تفسیر مختلف اقسام میں تقسیم ہوتی ہے اور فقط اربابِ علم و فن ہی تفسیر کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

*۔ فاضل قم، محقق علوم اسلامیہ، مدرسہ امام خمینیؒ، قم

مقدمہ

تعلیم و تحقیق کا معاشرے سے براہِ راست تعلق ہے، وہی علم مفید ہے جو معاشرے کے لئے سود مند ہو اور وہی تحقیق کارآمند ہے جو معاشرتی مسائل کا حل پیش کرے۔اس وقت ہمارا معاشرہ گوناگوں مسائل کا شکار ہے، جن میں سے سرفہرست سیاسی، کلامی، اقتصادی اور اجتماعی مسائل ہیں۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ان مسائل کی تدریس اور تبلیغ ایسے لوگ کرتے ہیں جنہوں نے کسی مستند ادارے سے ان موضوعات میں تعلیم حاصل نہیں کی ہوتی۔جب بھی کسی شعبے میں کوئی غیر متخصص اپنی رائے دینے لگتا ہے تو یہیں سے تفسیر بالرائے کا دروازہ کھلتا ہے۔ بعض اوقات دیکھنے میں یہ بھی آتا ہے کہ دونوں طرف غیر متخصص افراد ہی آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں منبر و محراب اور قلم پر ان لوگوں کا قبضہ ہے جو معارف دینی سے کم آشنائی رکھتے ہیں اور یا پھر بالکل آشنائی ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ ایسے لوگ قرآن و حدیث کی من مانی تفسیریں اور تاویلیں کرتے ہیں جس سے معاشرے میں علم کے بجائے جہالت اور ہدایت کے بجائے گمراہی میں اضافہ ہورہا ہے۔اس وقت ہمارے سماج میں ہر طرف تفسیر بالرائے کا دور دورہ ہے اور لوگ تفسیر بالرائے کو سمجھتے ہی نہیں کہ یہ کیا چیز ہے بلکہ بعض تو تفسیر بالرائے کو تفسیر عقلی کہتے ہیں۔اس لئے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے تفسیر کو واضح کیا جائے کہ تفسیر کسے کہتے ہیں، اس کے بعد تفسیر بالرائے اور تفسیر عقلی پر روشنی ڈالی جائے تاکہ لوگ خود سے یہ تشخیص دے سکیں کہ تفسیر بالرائے اور تفسیر عقلی میں کیا فرق ہے۔

اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ عوام النّاس کی ذہنی سطح کو بلند کرنے کے لئے مباحث تفسیر کو عمومی مخاطب کی حد تک واضح اور روشن طریقے سے بیان کیا جائے۔سب سے پہلے لغت اور اصطلاح میں تفسیر کے معانی کو سمجھتے ہیں:

تفسیر کا لغوی معنیٰ

"تفسیر" کا مادہ (ف، س، ر) ہے اور یہ باب تفعیل کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں ظاہر، کشف، تشریح اور توضیح و تفصیل بیان کرنا اور کسی عبارت کے مطلب کو واضح اور بیان کرنا نیز بند چیز کو کھولنا۔(1) راغب

اصفہانی کے مطابق کلمہ فسر اور سفر دونوں آپس میں بہت نزدیک ہیں۔ چونکہ دونوں کا مطلب کشف کرنا، پردہ اٹھانا اور روشن کرنا ہے۔ البتہ ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ فسر کا کلمہ امورِ معنوی کو روشن کرنے کے لئے جبکہ سفر اجسامِ مادی کو ظاہر کرکے آنکھوں سے دیکھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔(2)

تفسیر کا اصطلاحی معنیٰ

ہم یہاں پر اکابر مفسرین کی اصطلاح میں تفسیر کے معانی بیان کریں گے تاکہ قارئین کو علمِ تفسیر کی شناخت میں کوئی مشکل پیش نہ آئے:

علامہ طباطبائی: قرآنی آیات کے معانی کو بیان کرنا اور آیات کے مقصود و مدلول (خدا کی مرضی) کو واضح کرنا تفسیر کہلاتا ہے۔(3)

ابوالفتوح رازیؒ: آیت کے قصے، معنی اور سبب نزول کو کشف کرنے کا نام تفسیر ہے۔(4)

زرکشیؒ: تفسیر ایسا علم ہے کہ اس کے وسیلے سے اللہ کی وہ کتاب جو پیغمبرِ اسلام ﷺ پر نازل ہوئی اس کی پہچان ہو، اس کے معانی سمجھ میں آئیں اور اس کے احکام نیز اسرار و رموز ہاتھ میں آئیں۔(5)

طبرسیؒ: تفسیر سے مراد مشکل کلمے سے پردہ ہٹانا اور معانی کو روشن کرنا اور مراد خداوندی کو کشف کرنا ہے۔(6)

مذکورہ بالا تعریفوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فقط لفظ کے معنی کو سمجھنے کا نام تفسیر نہیں ہے، بلکہ اللہ کی مرضی کو کشف کرنے کا نام تفسیر ہے۔

مفسر کے لئے لازمی علوم

ہم یہاں پر یہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک مفسر کے لئے ابتدائی طور پر چند علوم کا حصول ضروری ہے:(7)

علوم قرآن: یعنی محکم و متشابہات، ناسخ و منسوخ، تاویل و تنزیل۔۔۔کا علم

علوم حدیث: تاریخ حدیث، درایت و روایت۔۔۔کا علم

ادبی علوم یعنی: صرف، نحو و معانی بیان وغیرہ

لہٰذا کوئی بھی آدمی قرآن مجید کی تفسیر کرنے کا حق نہیں رکھتا مگر یہ کہ اسے مبانی اور قواعد تفسیری پر بھی دسترس حاصل ہو۔

مبانی تفسیر

مبانی، بنیاد نیز اساس اور پائے کو کہتے ہیں۔ مفسر، تفسیر کرنے سے پہلے علمی طور پر یہ جان چکا ہو کہ اس کے نزدیک ظواہر قرآن حجت ہیں یا نہیں! اسی طرح قرائات سبعہ میں سے کونسی قرائت اس کے لئے حجت ہے، یا پھر قرائات سبعہ کے لئے اصلاً حجیت ثابت نہیں ہے۔ مفسر جس نظریے کو اپنے لئے اساس بنائے گا اسی کی بنیاد پر تفسیر کرے گا۔ ایک مفسر کو مندرجہ ذیل مبانی پر مکمل دسترس ہونی چاہیے اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اس کا نکتہ نظر واضح ہونا چاہیے:

1) قرآن کا منبع وحی ہے
2) . قرآن کا تحریف سے پاک ہونا
3) دعوت قرآن کی ابدیت
4) دعوت قرآن کی عمومیت
5) جامعیت قرآن
6) قرآن کے فہم اور تفسیر کا ممکن اور جائز ہونا
7) ظواہر قرآن کی حجیت
8) تفسیر قرآن میں اجتہاد کا جائز ہونا .
9) قرآن مجید میں مختلف بطون کا پایا جانا
10) قرآن کی مختلف قرائتوں کی حجیت

11)　آیات متشابہ قرآن کا قابل تفسیر ہونا

12)　قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ کا وجود.

13)　قرآن میں عدم اختلاف و تناقض

14) آیات اور سورتوں کے نظم کا توقیفی ہونا

15) سورتوں اور آیات کے درمیان تناسب کا پایا جانا

قواعد تفسیر

اسی طرح قاعدہ، عربی میں اصول اور اساس کو کہتے ہیں۔ اگر مفسر تفسیری اصولوں اور قواعد کی پابندی نہیں کرے گا تو ہوائے نفس اور وہم و خیالات کے ساتھ ساتھ اپنے وسواس اور توہمات کی جمع آوری کرتا رہے گا۔ایک مفسر کے لئے مندرجہ ذیل قواعد کی پابندی ضروری ہے۔ان قواعد کی پابندی کے بغیر تفسیر قرآن مجید کرنا ناممکن ہے۔

۱. آیات کریمہ قرآن کو قرائت رسولِ خداﷺ کے مطابق تفسیر کیا جائے۔

۲. اگر کوئی آیت ایک سے زیادہ قرائت کے ساتھ پڑھی گئی ہو تو یہ ت واضح کر دیا جائے کہ رسول اکرمﷺ نے کس قرائت کے ساتھ پڑھی ہے اور آیت کا معنیٰ صرف اسی قرائت کے مطابق کیا جائے جو قرائت رسول گرامیﷺ ہو بصورت دیگر یہ نہ کہا جائے کہ اس آیت سے یہ مراد ہے بلکہ ایک جامع معنیٰ سامنے لایا جائے جو تمام قرائتوں کے مطابق ہو۔

۳. آیات کی تفسیر نزول قرآن کے زمانے کے مطابق کی جائے۔

۴. کلمات کے معانی کو تشخیص دینے کے لئے زمانہ نزول کی لغت کے مطابق ترجمہ کیا جائے۔

۵. قرائن کے بغیر کسی بھی کلمے کا مجازی معنا نہ کیا جائے۔

۶. مشترک لفظی ہونے کی صورت میں ایک لفظ کو دیگر الفاظ پر ترجیح دینے کے لئے ٹھوس دلائل دینے چاہیے۔

۷. مشترک معنوی کی صورت میں معنی کو مشخص کرنے کے لئے روشن قرائن سے استفادہ کیا جائے۔

۸. آیات کی تفسیر میں قرائن متصل و منفصل ہر دو پر یکساں توجہ رکھی جائے۔

۹. جو آیات اسباب نزول رکھتی ہیں ان کے سیاق و سباق کو مد نظر رکھا جائے۔

۱۰. جو آیت تنہا نازل ہوئی ہے اس کی تفسیر دیگر آیات کے سیاق سے ملا کر نہ کی جائے۔
۱۱. ہر آیت کے نزول کے موقع و محل (سبب، شأن، زمان و مکان نزول و تہذیب و ثقافت و تمدن) کو مد نظر رکھا جائے۔
۱۲. معنای ظاہر آیات کو نازل کرنے والے (یعنی اللہ تعالیٰ) کی صفات اور جس پر نازل کیا گیا اس کی صفات (پیغمبر خاتم ﷺ اور اس زمانے کے مخاطبین کی صفات کو سامنے رکھتے ہوئے تفسیر کی جائے۔
۱۳. آیات کا ظاہری ترجمہ عقل و فطرت اور بدیہات سے نہ ٹکرائے۔
۱۴. آیات کا ظاہری معنی تعین کرنے کے لئے جستجو اور تگ و دو کے بغیر قرائن منفصل کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔
۱۵. قرآن خود مفسر قرآن ہے، لہٰذا قرآن مجید کی دیگر آیات اور ان کے باہمی ارتباط کو سامنے رکھ کر تفسیر کی جائے۔
۱۶. آیات کی تفسیر میں علوم قطعی سے ممکنہ حد تک استفادہ کیا جائے اور وہم و ظن و گمان سے پرہیز کیا جائے۔
۱۷. آیات کے مقصود کامل اور واقعی کو سمجھنے کے لئے کلام کی دلالت عرفی کو سامنے رکھا جائے۔
۱۸. آیات کے باطن کو روایات کی مدد کے بغیر بیان کرنے سے اجتناب کیا جائے (8)

منابع تفسیری

لغت میں منبع سے مراد سر چشمہ (9) ہے، زمین میں جس مقام سے پانی جوش مار کر باہر نکلتا ہے اسے بھی منبع کہا جاتا ہے۔ (10) اصطلاح میں اس مصدرِ اصلی و اوّلیہ کو منبع کہا جاتا ہے جس سے کسی مطلب کو نقل کیا جاتا ہے۔ انگلش میں اسے source کہتے ہیں۔ منابع تفسیر سے مراد ایسی عقلی، نقلی اور تجربی معلومات ہیں جو قرآن مجید کی آیات سے خدا کی مرضی کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ یہاں معلومات سے مراد ایسے علوم و فنون ہیں کہ جن سے مدد لئے بغیر مفسر آیات قرآن کو نہیں سمجھ سکتا۔ منابع تفسیر مجموعی طور پر پانچ اقسام میں تقسیم ہوتے ہیں:

۱۔ منابع نقلی ۲۔ منابع عقلی ۳۔ منابع علمی ۴۔ منابع لغوی ۵۔ منابع تاریخی

۱۔ منابع نقلی

منابع نقلی سے مراد قرآن مجید اور احادیث ہیں۔

۲۔ منابع عقلی

منابع عقلی سے مراد بدیہیات و مقدمات عقلی و قطعی ہیں۔انسان منابع عقلی سے کبھی بطور وسائل اور چراغ استفادہ کرتا ہے، جیسے جمع آوری آیات و روایات اور کبھی بطور منبع جیسے استدلال و براہین۔

۳۔ منابع علمی

منابع علمی سے مراد علوم تجربی و علوم انسانی ہیں۔

۴۔ منابع لغوی

منابع لغوی سے مراد ایسی لغات اور متون ہیں جو زمانہ نزول کے مطابق کلام کی وضاحت کرتے ہیں۔ جیسے فرامین معصومینؑ، اقوال صحابہؓ اور زمانہ جاہلیت کے اشعار وغیرہ

۵۔ منابع تاریخی

فہم قرآن میں منابع تاریخی کا بہت زیادہ عمل دخل ہے، چونکہ قرآن بہت سارے تاریخی واقعات کو بیان کرتا ہے اور ان سے انسانوں کے لئے وعظ و نصیحت کا کام لیتا ہے۔ اسی طرح تاریخ کی بدترین اور بہترین اقوام کا ذکر کرتا ہے تاکہ انسان اپنی عاقبت پر نظر رکھے۔ مفسر کے لئے ضروری ہے کہ وہ تفسیر کرتے ہوئے اپنے منابع کو بیان کرے اور منابع کے مطابق تفسیر کرے۔ مثلاً اگر اس نے کسی خاص علمی شعبے میں علم حاصل کیا ہو اور اس شعبے کی رو سے تفسیر کرنا چاہتا ہو تو اپنے منابع کا ذکر ضرور کرے۔

جس طرح اگر کسی نکو علم کلام میں مہارت حاصل اہے اور وہ تفسیر کے مبانی اور قواعد پر بھی کامل عبور رکھتا ہے تو وہ تفسیر کلامی کرنے کا حق رکھتا ہے، مگر منابع کے ذکر کے ساتھ، اسی طرح اگر کسی نے مذکورہ علوم کے ہمراہ علومِ عقلی میں بھی مہارت حاصل کر رکھی ہے اور وہ تفسیری قواعد اور مبانی کی

گہرائیوں میں بھی اتر چکا ہے تو پھر وہ منابع کے ساتھ تفسیر عقلی کرنے کا مجاز ہے۔اسی طرح اگر کسی نے کسی مستند ادارے سے مذکورہ بالا علوم کے ساتھ عرفان اسلامی میں تخصص کیا ہے اور تفسیر کے مبانی اور قواعد پر دسترس رکھتا ہے تو پھر صرف اور صرف وہی تفسیر عرفانی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے بشرطیکہ منابع کو بیان کرے۔

منابع کو بیان کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ بیان کرنے والا منابع اولیہ، ثانویہ یا ثالثہ میں سے کس سے استفادہ کر رہا ہے۔ کسی بھی شخص کے منابع جس قدر اوّلیہ ہونگے اس کی تحقیق بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہوگی۔

یہاں تک تفسیر کی شناخت کے بارے میں گفتگو تھی۔اب تفسیر بالرائے کی شناخت کی طرف آتے ہیں:

تفسیر بالرائے

اسلام کے ابتدائی سالوں میں ہی تفسیر بالرائے کا آغاز ہوگیا تھا اور لوگوں نے مختلف اہداف کی خاطر آیات کی من مانی تفاسیر شروع کر دی تھیں۔ مثال کے طور پر ابی بن کعب سے نقل ہوا ہے کہ میں نے رسولِ خداﷺ کے سامنے سورہ عصر کی تلاوت کی اور پھر آپ سے اس کی تفسیر چاہی، حضورﷺ نے فرمایا: والعصر، اللہ کی قسموں میں سے ایک ہے ،ان الانسان لفی خسر اس سے مراد ابو جہل ہے اور الاالّذین امنوا سے مراد ابو بکر اور عملوالصالحات سے مراد عمر اور تواصو بالحق سے مراد عثمان اور تواصوا بالصبر سے مراد علیؑ ہیں اور پھر کہا کہ ابن عباسؓ نے اس طرح سے لوگوں کو خطبہ دیا ہے۔

یہ روایت کہ جو تفسیر قرطبیؒ (11) میں نقل ہوئی ہے اس کی کوئی سند نہیں۔ اسی طرح اہل سنت کے معروف مفسر رشید رضا" الواح حضرت موسیٰؑ" کے بارے میں وارد ہونے والی روایات کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی اکثریت اسرائیلیات میں سے ہے اور کعب الاحبار اور اس جیسے لوگوں نے ایسی روایات مسلمانوں کے درمیان پھیلائی ہیں۔(12)

تفسیر بالرائے کی نشانیاں

تفسیر بالرائے میں مجموعاً پانچ خامیاں یا نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ان میں سے اگر ایک بھی خامی کسی تفسیر میں پائی جائے تو وہ تفسیر بالرائے کہلائے گی۔

۱۔ مذکورہ بالا علوم، مبانی اور قواعد سے جو عاری ہو اسے تفسیر بالرائے کہتے ہیں۔

۲۔ مفسر کے ذہن میں پہلے سے ایک عقیدہ اور مفروضہ ہوتا ہے اور مبانی و قواعد نیز علوم سے ہٹ کر وہ اپنے مفروضے اور عقیدے کے مطابق تفسیر کرتا ہے۔

۳۔ مفسر فنونِ تفسیر میں سے کسی ایک کا سہارا لے کر اپنے نظریے کو قرآن مجید پر زبردستی ٹھونستا ہے۔ مثلاً وہ کسی آیت کے صرف کلمات کا لغت سے مطلب بیان کر کے کہتا ہے کہ اس آیت سے یہ بات مراد ہے۔

۴۔ مسلمات تاریخی اور علوم قطعی کے خلاف

۵۔ نصوص قرآن واحادیث کے خلاف

یاد رہے کہ تفسیر بالرائے صرف قرآن مجید کی ہی نہیں کی گئی، بلکہ روایات پیغمبر ﷺ کی بھی تفسیر بالرائے کی گئی جیساکہ جنگِ صفین میں حضرت عمار یاسرؓ کی شہادت کے وقت اس حدیث کی تفسیر بالرائے کی گئی:

احادیث میں تفاسیر بالرائے کا نمونہ

حدیث شریف میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت عمار سے فرمایا: انك لن تموت حتى تقتلك الفئة الباغية الناكبة عن الحق یعنی: "اے عمار آپ کو موت نہیں آئے گی یہاں تک کہ آپ کو ایک باغی اور حق سے منحرف گروہ قتل کرے گا۔"(13)

حضرت عمار یاسرؓ کے قتل کے بعد ان کے قاتلوں نے اس حدیث کی یہ تفسیر کرنی شروع کر دی تھی کہ چونکہ حضرت عمار یاسرؓ، حضرت علیؑ کے لشکر میں تھے اور حضرت علیؑ ہی ان کو میدان میں لائے تھے لہٰذا وہی حضرت عمارؓ کے قاتل اور باغی ہیں۔ یہاں بات کو سمجھانے کی خاطر احادیث میں تفسیر بالرائے کا فقط ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

کسی بھی تفسیر میں مذکورہ بالا پانچ میں سے اگر کوئی ایک نشانی بھی پائی جائے تو وہ تفسیر بالرائے ہوگی۔ تفسیر بالرائے چونکہ تفسیر نہیں ہوتی بلکہ کسی شخص کی ذاتی آرااور عقائد کا ملغوبہ ہوتی ہے جسے وہ چند جعلی و ضعیف روایات اور تشابہ لغات سے تیار کرتا ہے، لہٰذا ماہرینِ علم و فن اسے تفسیر نہیں کہتے۔

تفسیر بالرائے کی مذمت

امام علیؑ نے ایک قاضی سے پوچھا کہ هل تعرف الناسخ والمنسوخ فقال لا: فقال هلكت او اهلكت" تاويل كل حرف من القرآن على وجوه یعنی: "کیا تم ناسخ اور منسوخ کو پہچانتے ہو، اس نے کہا نہیں، امامؑ نے فرمایا تو خود بھی ہلاک ہوااور دوسروں کو بھی تو نے ہلاک کیا، قرآن مجید کے ہر حرف کی جہات ہیں۔" (14)
اسی طرح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے قتادہ سے فرمایا: "ان كنت انما فسرت القرآن من تلقاء نفسك فقد هلكت و اهلكت" یعنی: "اگر تم نے قرآن مجید کی تفسیر اپنی جانب سے کر دی تو تم خود ہلاک ہو جاؤ گے اور دوسروں کو بھی ہلاک کروگے۔" (15)

دھوکہ اور تفسیر عقلی

عموماً تفسیر بالرائے کرنے والے لوگ عام لوگوں کو یہ کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں کہ ہم قرآن مجید کی تفسیرِ عقلی کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ ایک آدھ آیت پڑھنے کے بعد اس کے کلمات کا درست یا غلط ترجمہ کرکے اپنے مفروضات کو پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یا پھر آیت کے بعد ضعیف یا جعلی روایات لے کر اپنا مدعا بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یا پھر لوگوں کو فریب دینے کے لئے بڑی بڑی کتابوں کے نام لئے جاتے ہیں، حالانکہ علمائے اسلام کے نزدیک کسی بھی کتاب کی ساری روایات معتبر نہیں ہیں اور ہر روایت کی سند اور متن کو تحقیق کی ضرورت ہے۔ آیات پڑھ کر جعلی اور ضعیف روایات کو جوڑ کر ساتھ ایک آدھ کہانی بھی ملا کر لوگوں کے عقائد و افکار کو خراب کیا جاتا ہے۔
یہ ایک ایسی چال ہے کہ جس میں پڑھے لکھے افراد بھی باآسانی پھنس جاتے ہیں۔ ایسے افراد سے اگر یہ پوچھا جائے کہ آپ نے یہ تفسیر کہاں سے بیان کی ہے تو چونکہ وہ کسی مستند ادارے کے فارغ التحصیل نہیں ہوتے، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ ہم تفسیر عقلی کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کے فریب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ علم تفسیر میں عقل سے کیا مراد ہے اور تفسیرِ عقلی کسے کہا جاتا ہے!

علم تفسیر میں عقل کی اقسام

سب سے پہلے یہ جانیں کہ انسان اپنا ہر کام عقل کی مدد سے کرتا ہے اور تفسیر کی تمام اقسام میں عقل کا استعمال ایک بدیہی امر ہے۔ حتیٰ کہ خرید و فروش، لین دین، تجارت اور معاشرے کے دیگر تمام امور بھی عقل کے تابع ہیں۔ یہ عقل کا انتہائی معمولی درجہ ہے، اسے عقلِ مصباحی کہتے ہیں۔ یعنی عقل ایک اوزار اور چراغ کی مانند ہماری رہنمائی کرتی ہے، لیکن بطور منبع ہم اس سے استفاد نہیں کر رہے ہوتے۔ عقلِ مصباحی سے سبھی لوگ ہر جگہ استفادہ کرتے ہیں، جیسے آیات و روایات کی جمع آوری میں بھی عقل استعمال ہوتی ہے، اس کے بعد آیات و روایات کی جمع بندی میں بھی عقل سے استفادہ کیا جاتا ہے، چنانچہ اس عقل سے قرآن مجید کی تفسیر تو کی جا سکتی ہے، لیکن اس تفسیر کو تفسیر عقلی نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن مجید کی عقلی تفسیر کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی عقل سے استدلال و برہان کی روشنی میں کھلی ہوئی کتاب کی مانند بطورِ منبع استفاد کریں۔ یعنی بطور خلاصہ عقل کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ عقلِ مصباحی، جس سے بطورِ آلہ اور اوزار سب استفادہ کرتے ہیں۔

۲۔ عقلِ منبعی، جس سے تفسیر قرآن عقلی میں استفادہ کیا جاتا ہے۔(16)

عقل منبعی سے مراد اور تفسیر عقلی

عقل حجت باطنی ہے جو انسان کو کمال و سعادت کی طرف لے جاتی ہے اور شریعت حجت ظاہری و بیرونی ہے جو انسان کو کمال و خوشبختی کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ حجتِ باطنی و ظاہری ایک دوسرے سے متعارض ہوں بلکہ یہ ایک دوسرے کی مدد اور تقویت کا باعث بنتی ہیں۔ قرآن مجید میں عقل کے مشتقات جیسے تعقلون اور یعقلون پچاس مرتبہ استعمال ہوئے ہیں،(17) اسی طرح عقل سے کام لینے کے لئے قرآن مجید میں تدبّر، تفکر، تعقل اور قلب کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔

علمِ تفسیر میں جب ہم تفسیرِ عقلی کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد تفسیر میں عقل کو بطورِ منبع استعمال کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید کا منبع وحی ہے اور تفسیر قرآن بہ قرآن کا منبع خود قرآن ہے، اسی طرح تفسیر قرآن بالروایات کا منبع احادیث ہیں۔ جو شخص قرآن مجید کو نہیں پڑھ سکتا وہ قرآن مجید سے بطور منبع استفادہ

بھی نہیں کر سکتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان کو عربی ادبیات، قواعد اور متن خوانی پر عبور ہو، اسی طرح جو علومِ حدیث کے ساتھ احادیث کو نہیں پڑھ سکتا وہ احادیث سے بطور منبع استفادہ نہیں کر سکتا۔ یونہی قرآن فہمی کا ایک منبع عقل ہے جو شخص علوم عقلی کے ساتھ کتابِ عقل کو نہیں پڑھ سکتا وہ تفسیر عقلی بھی نہیں کر سکتا۔ تفسیر عقلی وہ ہے جس میں استدلال اور برہان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ استدلال سے مراد تمثیل، استقرا اور قیاس ہیں اور برہان سے مراد برہانِ لمّی (علت سے معلول کو پہچاننا) اور برہانِ اِنّی (معلول سے علت کو پہچاننا) ہے۔

استدلال و برہان کی اقسام

تمثیل

تمثیل ایک منطقی استدلال ہے اور اس سے مراد دو امور میں مشابہت کی بنیاد پر ایک حکم کو دوسرے میں سرایت دینا ہے (18)، استدلال تمثیلی کا نتیجہ استدلال قیاسی کی مانند قطعی نہیں ہوتا اس لئے استدلال تمثیلی میں نتیجے کے ہمراہ احتمال کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

استقرا

استدلال منطقی میں دوسری اصطلاح استقرا ہے، جسے انگلش میں Induction کہتے ہیں، منطق قدیم میں جز کا حکم کل پر لگانے کو استقرا کہتے تھے جبکہ منطق جدید میں طے شدہ منصوبہ بندی کے ساتھ جزئیات کے مشاہدے سے ایک نتیجہ لینے کو استقرا کہتے ہیں۔ (19) استقرا کی دو اقسام ہیں:

استقرا کی اقسام

استقرا کی دو قسمیں ہیں: استقرا تام اور استقرا ناقص

استقرا تام

ایسے استقرا کو کہتے ہیں کہ جس میں تمام افراد کی خصوصیات پر تحقیق کی جاتی ہے اور پھر ان سب کے بارے میں ایک ایسا حکمِ کلی لگایا جاتا ہے جو ان سب پر صدق کرتا ہے۔

استقرا ناقص

یہ ایسے استقرا کو کہا جاتا ہے کہ جس میں تمام افراد کے بجائے کچھ افراد کی خصوصیات پر تحقیق کی جاتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اس طرح کے تمام افراد پر یہ حکم لگتا ہے۔

قیاس

قیاس منطقی یہ ہے کہ اگر درست مقدمات کے ساتھ کل سے جز پر حکم لگایا جائے تو وہ صحیح ثابت ہوگا۔

مثلا: ہم تین مفروضے فرض کرتے ہیں:۔

ا۔ چاند ایک سیارہ ہے ۲۔ ہر سیارہ حرکت کرتا ہے ۳۔ پس چاند حرکت کرتا ہے

پہلے دو مفروضے درست ہونے کی صورت میں تیسرا مفروضہ بھی درست ہوگا۔

اس کے بعد کچھ وضاحت برہان کے بارے میں پیش کی جاتی ہے۔

برہان

اہل منطق کے نزدیک برہان مقدمات یقینی سے ایسا ترکیب شدہ قیاس ہے کہ جس سے حتماً یقینی نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ مقدمات یقینی کی قید سے مظنونات، تخیلات اور مشہورات و غیرہ خارج ہو جاتے ہیں۔ برہان کی بھی دو قسمیں ہیں: برہان لمّی اور برہانِ انّی

برہان لمّی

برہان لمّی یعنی علت سے معلول کو پہچاننا اور برہانِ انّی یعنی معلول سے علت کو پہچاننا، آگے برہان لمّی کی بھی دو اقسام ہیں: برہان لمی مطلق و برہان لمی غیر مطلق۔

برہان اِنّی

اسی طرح برہان اِنّی کی بھی دو قسمیں ہیں، ا۔ دلیل یعنی ایسا برہان کہ جس میں وجود معلول سے وجود علت پر استدلال کیا جائے۔ ۲۔ برہان اِنّی مطلق یعنی ملازمات عامہ پر انحصار کیا جائے اور ایک چیز کے وجود سے دوسری کے وجود کا اثبات ہو۔

خلاصہ

یہ استدلال و برہان کا مختصر تعارف تھا اور اس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جس تفسیر میں استدلال و برہان سے استفادہ ہوگا وہ تفسیر عقلی کہلائے گی، بصورتِ دیگر اسے ماہرین علم تفسیر کے مطابق تفسیر عقلی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر مفسر استدلال و برہان کے ساتھ ساتھ ادبی، تاریخی اور حدیثی دلائل بھی لائے تو اسے تفسیر اجتہادی کہیں گے۔ پھر بھی اسے تفسیر عقلی نہیں کہیں گے۔ اسی طرح تفسیر عقلی کا میدان تفسیر فلسفی سے بھی جدا ہے۔

تفسیر فلسفی میں اخلاق ستیزی، اخلاق گرایی، ایدئالیسم، ایمان گرایی، انسان گرایی، اگزیستانسیالیسم، حکمت متعالیہ، فلسفہ مشا اور فلسفہ اشراق سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس میں وجود اور ماورای وجود سے ریاضیاتی طور پر بحث کی جاتی ہے اور اس کی اپنی مخصوص اصطلاحات اور تعریفیں ہیں۔ اگر تفسیر فلسفی بھی مبانی اور قواعد تفسیری کے مطابق نہ ہو تو وہ بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

نتیجہ

تفسیر بالرائے مذموم ہے جبکہ تفسیر عقلی ممدوح ہے۔ ہمارے معاشرے میں قرآن مجید اور حدیث دونوں مہجور ہیں اور ہمارے عوام علوم قرآن و حدیث سے ابتدائی آشنائی بھی نہیں رکھتے جس کی وجہ سے منبر و محراب اور قلم پر ان پڑھ لوگوں کا قبضہ ہے۔ یہ لوگ عوام کے احساسات و جذبات سے کھیلنے کے لئے آیات و روایات کی تفسیر بالرائے کرتے ہیں اور لوگوں کو کہتے ہیں کہ ہم تفسیر عقلی کر رہے ہیں۔ ان تفسیر بالرائے کرنے والوں میں سے اکثریت خود بھی یہ نہیں جانتی کہ وہ نہیں جانتی۔ یہ نادانی اور جہالت کی بنا پر اپنے فہم ذاتی کو مرضیِ پروردگار کہہ کر لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں، یہ اپنے وسواس، خیالات اور وہم و ظن کو نعوذ باللہ تفسیر قرآن کہتے ہیں۔ جبکہ تفسیر قرآن چاہے عقلی ہو یا عرفانی یا فلسفی اس کے اپنے علوم و فنون ہیں اور کوئی بھی شخص اگر ان علوم و فنون پر دسترس حاصل کئے بغیر تفسیر قرآن کرے گا تو بقول امام معصومؑ وہ خود بھی ہلاک ہو جائے گا اور دوسروں کی ہلاکت کا باعث بھی بنے گا۔

ہمارے پاس قرآن و حدیث انسانی نجات کا اوّلین اور ناب وسیلہ ہیں، کوئی بھی انسان قرآن و حدیث سے تمسک کئے بغیر سعادت و خوشبختی کو نہیں پا سکتا۔ قرآن و حدیث ہی خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ ہیں۔ ہمارے ہاں جابجا تفسیر بالرائے سے استفادہ کیا جارہا ہے اور لوگ تفسیر بالرائے کو تفسیر عقلی سمجھ

کر قبول کر رہے ہیں۔ معاشرے میں تفسیر بالرائے کے ذریعے پھیلائے گئے افکار و عقائد کا مقابلہ کرنا ہمارے دینی مراکز کی اولین ذمہ داری ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ علمی و فکری بنیادوں پر علوم قرآن، علوم حدیث اور علوم تفسیر کو ہر خاص و عام تک پہنچایا جائے۔ اگر ہم علمی طور پر عوام کی ذہنی سطح بلند کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو عوامی اجتماعات سے تفسیر بالرائے کا خاتمہ خود بخود ہو جائے گا۔

یہ ایک یقینی امر ہے کہ تفسیر بالرائے اس زمانے کا ایک بہت بڑا فتنہ ہے اور دیگر تمام فتن اسی فتنے سے پرورش پا رہے ہیں، چنانچہ عوام کے علمی ارتقا، دینی مدارس کی فعالیت اور مفاہیم دینی کی درست تبیین کے ذریعے اس فتنے کی جڑوں کو کاٹنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

خود مبلغین دین کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تبلیغ دین کے ذریعے تفسیر شناسی کو عام کریں اور قرآن مجید کی مختلف تفاسیر کی شناخت اور پیغامات کو زبان و قلم کے ذریعے معاشرے میں رواج دیں۔ اگر لوگوں میں تفسیر شناسی کا ہنر بیدار ہو جائے اور وہ تفسیر بالرائے کو پہچان لیں تو معاشرے میں بہت سارے مفاسد و مسائل پر باآسانی قابو پایا جا سکتا ہے۔ لوگوں کو یہ سمجھانا ضروری ہے کہ تفسیر عقلی فقط وہ تفسیر ہے جس میں استدلال اور براہین سے استفادہ کیا جاتا ہے نہ کہ جعلی روایات اور قصے کہانیوں سے۔

*****

حوالہ جات

1 ۔ ابن منظور، محمد بن مکرم الافریقی، لسان العرب، نشر ادب الحوزہ، قم، ایران، 1405، ج 2، ص 136

2 ۔ راغب اصفہانی، حسین، تفسیر الراغب الأصفہانی (مقدمہ)؛ بیروت، دار العلم الدار الشامیۃ، ۱۴۱۲ق ص۱۰: الفسر والسفر یتقارب معناهما کتقارب لفظیهما، لکن جعل الفسر لإظهار المعنی المعقول ومنه قیل لما ینبئ عنه البول تفسیره، وتسمی بها قارورة الماء. وجُعل السفر لإبراز الأعیان للأبصار۔

3 ۔ طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ا مقدمہ؛ مؤسسۂ دار العلم قم۔

4۔ رازی، ابوالفتوح، رُوح الجنان ورَوح الجنان؛ بنیادپژوہشای اسلامی مشہد، ج۱/۹۔
5۔ بدرالدین محمد بن بہادر زرکشی (۷۴۵-۷۹۴) ، البرھان فی علوم القرآن، چاپ محمد ابوالفضل ابراہیم، بیروت ۱۹۸۸/۱۴۰۸. ج۱ص ۱۳۔
6۔ ابو علی، طبرسی، فضل بن حسن، مقدمہ مجمع البیان، الفن الثالث ، داراحیاء التراث العربی، بیروت ،۸ ۔
7۔ محمد فاضل موحدی لنکرانی، مقدمات بنیادین علم تفسیر ؛ مقدمہ، بنیاد قرآن تہران ۱۳۸۱ش، ص ۱۴۔
8۔ رضایی اصفہانی، محمد علی، منطق تفسیر قرآن (1)، قم، جامعہ المصطفیٰ العالمیۃ، چاپ یکم، 1387
9۔ ابراہیم انیس و دیگران، المعجم الوسیط، ج۲، ص۸۹۸، تہران، فرہنگ اسلامی، ۱۳۷۵
10۔ ابن درید (م۳۲۱ھ)، جمہرۃ اللغۃ، ج۱، ص۳۶۸، تحقیق رمزی بعلبکی، بیروت، دار العلم للملایین، ۱۹۸۷ء
11۔ تفسیر قرطبی، ابو عبداللہ، محمد بن احمد انصاری قرطبی، بیروت ۱۹۹۶/۱۴۱۷، ج۲۰/ ۱۸۰
12۔ تفسیر المنار، رشید رضا، الجامعۃ الرضویۃ للعلوم الاسلامیۃ، مشہد، ۱۹۹۰م، ج۹، ص ۱۶۴.
13۔ تاریخ طبری، طبری، محمد بن جریر، بنیاد فرہنگ ایران، 1352، ج3، جزء6، ص21; کامل ابن اثیر، ج3، ص157.
14۔ تفسیر عیاشی، ابوالنصر محمد بن مسعود بن عیاش سمرقندی، بنیاد بعثت قم 1379 ش، ج۱ /۱۲
15۔ الاصول الاصلیہ، عبداللہ الشبر، مکتبہ المفید، قم صفحہ ۲۲۱
16۔ درس خارج آیت اللہ جوادی آملی تفسیر تسنیم، ، مرکز نشر اسراء، قم، 30/11/89
17۔ علی دوست، ابوالقاسم، فقہ و عقل، پژوہشگاہ فرہنگ و اندیشۃ اسلامی، قم، ۱۳۸۱، ص۳۰-۲۹.
18۔ ارسطو، منطق ارسطو، ج۱، ص۳۰۸، چاپ عبدالرحمان بدوی، بیروت ۱۹۸۰.
19۔ منطق جدید، مہدی اخوان، استقرا، علمی و فرہنگی تہران ۱۳۷۳ش.

حسنین شریفینؑ کا رسول اللہ ﷺ سے انتساب
مفسرین کی نظر میں

سید رمیز الحسن موسوی*
Srhm2000@yahoo.com

کلیدی کلمات: حسنین شریفین، رسول اللہ، ذریت، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ،، مفسرین۔

خلاصہ

دین اسلام میں اُسوہ اور نمونۂ عمل شخصیات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کے مطابق اسلام کی سب سے بڑی نمونۂ عمل ہستی خود رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے۔آپؐ کے بعد آپؐ کی عملی سیرت اور نص کے مطابق کچھ دوسری دیگر ذوات مقدسہ بھی اُمت کے لئے اُسوہ اور نمونہ ہیں جن کی اتباع ضروری اور در حقیقت آپؐ ہی کی اتباع ہے۔ ان ہستیوں میں دو ہستیاں جناب حسنین شریفین علیہما السلام ہیں۔ بعض محققین اور شیعہ و اہل سنّت مفسرین جناب حسنین شریفین علیہما السلام کو رسولخدا ﷺ کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔

اس مقالہ میں اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ آیا جناب حسنین شریفین کو رسول اللہ ﷺ کی اولاد اور بیٹے قرار دینا ایک شرعی حقیقت ہے یا یہ محض ایک عرفی نسبت ہے؟ اس مقالے میں اسی موضوع پر بعض شیعہ اور اہل تسنن مفسرین کے اقوال اور استدلالات کو پیش اور اُس پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جناب حسنین شریفین کی رسول اکرم ﷺ کی طرف بیٹے ہونے کی نسبت، شرعی حقیقت اور شرعی حیثیت رکھتی ہے۔

*۔ معاون مدیر مجلّہ نور معرفت، معروف محقق؛ ڈائریکٹر نور الہدی مرکز تحقیقات، بارہ کہو، اسلام آباد

تمہید

دین اسلام میں اُسوہ شخصیات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جس کی سب سے بڑی وجہ ان ہستیوں کا پوری اُمت کے لئے نمونہ عمل ہونا ہے، انہی کو دیکھ کر دوسرے لوگ دین سیکھتے ہیں اور دین پر عمل کرتے ہیں۔ اسلام میں سب سے بڑی اُسوہ شخصیت خود نبی اکرم ﷺ کی ذات مقدس ہے، جن کو اُسوہ اور نمونہ خود قرآن مجید نے قرار دیا ہے: " لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا" (1) یعنی :در حقیقت تمہارے لئے رسول اللہ (ﷺ) میں نہایت ہی حسین نمونہ (حیات) ہے ہر اُس شخص کے لئے جو اللہ (سے ملنے) کی اور یومِ آخرت کی امید رکھتا ہے اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔

اسی لئے آپ ﷺ کا ہر قول و فعل پوری اُمت کے لئے حجت ہے، جس پر عمل کرنا سب مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ آپ ﷺ کے بعد بھی خود آنحضرت ﷺ کی عملی اور لسانی نص کے ذریعے کچھ شخصیات اُمت کے لئے اُسوہ اور نمونہ قرار پاتی ہیں جن کی اتباع در حقیقت آپ ﷺ ہی کی اتباع ہے اور جن کی پیروی در حقیقت دین اسلام کی پیروی ہے۔ انہی شخصیات میں آپ ﷺ کے دونواسے جناب حسنین شریفین علیہما السلام ہیں۔ جنہیں بعض قرآنی آیات کے مطابق آپ ﷺ کا فرزند ہونے کا شرف حاصل ہے اور ایسے فضائل و مناقب حاصل ہیں جو ایک اُسوہ اور نمونہ شخصیت میں ضروری ہیں۔ اس مقالے میں بعض قرآنی آیات کے ذیل میں جناب امام حسن مجتبیٰ و امام حسین سید الشہداء علیہما السلام کے جناب رسوا اللہ ﷺ کے ساتھ انتساب اور ان دونوں شہزادوں کی دینی شخصیت اور مقام و منزلت کے حوالے سے بعض مفسرین قرآن کے استدلال و نظریات پیش کئے جائیں گے۔ ان مفسرین نے فریقین کے اُنہی آراء کو انتخاب کیا گیا ہے جو مسلکی اور گروہی تعصب سے خالی ہیں اور جو قرآنی آیات کی مستند اور متفق علیہ تفسیر پیش کرنے میں تمام دینی منابع پر نظر اور تفسیری روایات اور احادیث کے سلسلے میں مکمل دسترس اور مہارت رکھتے ہیں۔ ان مفسرین نے جناب حسنین شریفین علیہما السلام کے بارے میں بہت سے عناوین کے تحت بحث کی ہے۔ یہاں فقط ان دونوں ہستیوں کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ انتساب کو پیش کیا جارہا ہے۔

حسنین شریفینؑ کا نسب

علماء اور مفسرین نے قرآن کریم کی درج ذیل آیات کے ضمن میں امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے نسب شریف کے بارے میں بحث کی ہے اور آپؑ کے فرزند رسول ﷺ ہونے کی تاکید کی ہے۔

1. فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ (2) یعنی: "پس آپ کے پاس علم آجانے کے بعد جو شخص عیسٰی (علیہ السلام) کے معاملے میں آپ سے جھگڑا کرے تو آپ فرما دیں کہ آجاؤ ہم (مل کر) اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو بھی اور تمہیں بھی (ایک جگہ پر) بلا لیتے ہیں، پھر ہم مباہلہ (یعنی گڑگڑا کر دعا) کرتے ہیں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجتے ہیں۔"

2. وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَقَ وَيَعْقُوبَ كُلاًّ هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَى وَهَارُونَ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ ۖ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ [3] یعنی: "اور ہم نے ان (ابراہیم علیہ السلام) کو اسحاق اور یعقوب عطا کئے، ہم نے (ان) سب کو ہدایت سے نوازا، اور ہم نے (ان سے) پہلے نوح کو ہدایت سے نوازا تھا اور ان کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسٰی اور ہارون کو، اور ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزا دیا کرتے ہیں۔ اور زکریا اور یحیٰی اور عیسٰی اور الیاس (کو بھی ہدایت بخشی)۔ یہ سب نیکوکار لوگ تھے۔ اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط (کو بھی ہدایت سے شرف یاب فرمایا) اور ہم نے ان سب کو (اپنے زمانے کے) تمام جہان والوں پر فضیلت بخشی اور ان کے آباؤ (واجداد) اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بھی (بعض کو ایسی فضیلت عطا فرمائی) اور ہم نے انہیں چن لیا تھا اور انہیں سیدھی راہ کی طرف ہدایت فرما دی تھی۔"

3. مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا

یعنی: "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور سب انبیاء کے آخر میں (سلسلۂ نبوت ختم کرنے والے) ہیں، اور اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھنے والا ہے۔"

جن مفسرین نے ان آیات کے ضمن میں یہ بحث کی ہے، اُن میں سے چند یہ ہیں:

1) ابی الفداء الحافظ ابن کثیر الدمشقی متوفی ۷۷۴ ھ

ابن کثیر، اپنی کتاب "تفسیر القرآن العظیم" میں سورۂ انعام کی آیت ۸۶ کے ذیل میں امام حسن بن علی علیہ السلام کے رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں: وَفِي ذِكْرِ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ أَوْ نُوحٍ، عَلَى الْقَوْلِ الْآخَرِ، دَلَالَةٌ عَلَى دُخُولِ وَلَدِ البنات في ذرية الرجل، لِأَنَّ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ إِنَّمَا يُنْسَبُ إِلَى إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، بِأُمِّهِ مَرْيَمَ عَلَيْهَا السَّلَامُ، فَإِنَّهُ لَا أَبَ لَهُ. قَالَ ابْنُ أَبِي حَاتِمٍ: حَدَّثَنَا سَهْلُ بْنُ يَحْيَى الْعَسْكَرِيُّ، حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ صَالِحٍ، حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَابِسٍ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَطَاءٍ الْمَكِّيِّ، عَنْ أَبِي حَرْبِ بْنِ أَبِي الْأَسْوَدِ، ...ويدخل بنو البنات فيهم أَيْضًا، لِمَا ثَبَتَ فِي صَحِيحِ الْبُخَارِيِّ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عليه وسلم قَالَ لِلْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ: "إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ" (4) فَسَمَّاهُ ابْنًا، فَدَلَّ عَلَى دُخُولِهِ فِي الْأَبْنَاءِ۔ (5)

یعنی: "اس لئے عیسی علیہ السلام کو ذریت ابراہیم علیہ السلام یا نوح علیہ السلام کے سلسلے میں لایا گیا ہے۔ گویا انہیں بھی ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں کہا گیا ہے۔ اس دلیل کی بناپر کہ بیٹی کی اولاد بھی آدمی کی نسل ہی میں سے سمجھی جاتی ہے۔ اب اگر عیسیٰ علیہ السلام کو ابراہیم علیہ السلام سے کوئی تعلق ہے تو صرف اس بناپر کہ ان کی ماں حضرت مریم علیہا السلام، ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھیں۔ ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ تو تھے ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ حجاج نے یحییٰ بن یعمر سے کہا کہ میں نے سنا ہے تم کہتے ہو کہ حسنؑ و حسینؑ ذریت نبی میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ علیؑ اور ابوطالب کی ذریت سے ہیں اور پھر یہ بھی دعوی بھی کرتے ہو کہ اس کا ثبوت قرآن سے ہے۔ میں نے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھا ہے کہیں اس کو نہ پایا۔ تو ابن یعمر نے کہا کیا تم نے سورۂ انعام میں نہیں پڑھا کہ "وَمِن ذُريته داود وسليمان" حتیٰ کہ وہ یحییٰ اور عیسیٰ تک پڑھتے چلے گئے۔ کہا کہ ہاں پڑھا ہے۔ کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ذریت ابراہیم علیہ السلام میں بتایا گیا ہے حالانکہ وہ باپ نہیں

رکھتے تھے صرف بیٹی کے تعلق سے ذریت میں قرار دیا گیا ہے تو پھر بیٹی کے تعلق سے حسن و حسین علیہم السلام ذریت نبی ﷺ میں کیوں نہ ہوں؟ حجاج نے کہا تم ٹھیک کہتے ہو۔

اسی لئے جب کوئی آدمی اپنی میراث کو ذریت کے نام پر وصیت کرتا ہے اور وقف یا ہبہ کرتا ہے تو اس ذریت میں اولاد بنات بھی داخل سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جب وہ بیٹوں کے نام دیتا یا ہبہ کرتا ہے تو خاص صلبی بیٹے ہی مستحق ہوتے ہیں یا پوتے۔ اور دوسروں نے تو کہا ہے اس میں اولاد بنات بھی داخل ہے۔ کیونکہ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسن بن علیؑ کے بارے میں فرمایا کہ میرا یہ بیٹا سید ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرادے گا اور جنگ کا فتنہ ختم ہو جائے گا چنانچہ حسنؑ کو ابن کے لفظ سے تعبیر کیا جو دلالت کرتا ہے کہ وہ اولاد میں داخل سمجھے جا سکتے ہیں۔"

2) حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ

جلال الدین سیوطی "الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور" کی جلد ۳ میں سورۂ انعام کی آیت ۸۴ کے ذیل میں یہ احادیث نقل کرتے ہیں: أخرج ابْن أبي حَاتِم عَن أبي حَرْب بن أبي الْأسود قَالَ: أرسل الْحجَّاج إِلَى يحيى بن يعمر فَقَالَ: بَلغنِي أَنَّك تزْعم أَن الْحسن وَالْحُسَيْن من ذُرِّيَّة النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم تَجدهُ فِي كتاب الله وَقد قرأته من أَوله إِلَى آخِره فَلم أَجِدهُ. قَالَ: أَلَسْت تقْرَأ سُورَة الْأَنْعَام {وَمن ذُرِّيَّته دَاوُد وَسليمَان} حَتَّى بلغ {وَيحيى وَعِيسَى} قَالَ: أَلَيْسَ عِيسَى من ذُرِّيَّة إِبْرَاهِيم وَلَيْسَ لَهُ أَب قَالَ: صدقت

وَأخرج أَبُو الشَّيْخ وَالْحَاكِم وَالْبَيْهَقِيّ عَن عبد الْملك بن عُمَيْر قَالَ: دخل يحيى بن يعمر على الْحجَّاج فَذكر الْحُسَيْن فَقَالَ الْحجَّاج: لم يكن من ذُرِّيَّة النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم: فَقَالَ يحيى: كذبت. فَقَالَ: لتَأْتِيني على مَا قلت بِبَيِّنَة. فَتلا {وَمن ذُرِّيَّته دَاوُد وَسليمَان} إِلَى قَوْله {وَعِيسَى وإلياس} فَأخْبر تَعَالَى أَن عِيسَى من ذُرِّيَّة إِبْرَاهِيم بِأُمِّهِ. قَالَ: صدقت"

یعنی: "امام ابن ابی حاتم نے ابو الحرب بن ابوالاسودؒ سے روایت کیا کہ حجاج نے یحییٰ بن یعمر کی طرف لکھ بھیجا کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ حسن اور حسین (رض) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اولاد میں سے ہیں اور تو اس کو اللہ کی کتاب میں پاتا ہے۔ اور میں نے اس کو اول سے لے کر آخر تک پڑھا ہے۔ مگر میں نے اس کو نہیں پایا۔ تو یحییٰ بن یعمر نے کہا: کیا تو نے سورۂ انعام نہیں پڑھی لفظ آیت ومن ذریتہ داؤد وسلیمن سے لے کر لفظ آیت ویحییٰ و عیسیٰ تک

اور فرمایا کیا عیسیٰ ابراہیم کی اولاد میں سے نہیں ہیں حالانکہ وہ ان کے باپ نہیں ہیں؟ حجاج نے کہا تو نے سچ کہا ہے۔
امام ابو الشیخ، حاکم اور بیہقی نے عبد المالک بن عمیرؒ سے روایت کیا کہ یحییٰ بن یعمر حجاج کے پاس آئے حسینؓ کا ذکر کیا یا تو حجاج نے کہا وہ نبی (ﷺ) کی اولاد میں سے نہیں ہے۔ یحییٰ نے فرمایا تو نے جھوٹ کہا ہے حجاج نے کہا میرے پاس اس بات کے گواہ لاؤ جو آپ نے بات کہی ہے تو انہوں نے یہ آیت پڑھی لفظ آیت "ومن ذریتہ داؤد وسلیمن" سے لے کر لفظ آیت "و عیسیٰ والیاس" تک کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ عیسیٰ ابراہیم کی اولاد میں سے ہیں اس کی ماں کی طرف سے حجاج نے کہا آپ نے سچ کہا۔" (6)

3) سید علی اکبر قرشی متولد ۱۳۰۷ شمسی

تفسیر احسن الحدیث کے مؤلف سید علی اکبر قرشی، سورۂ انعام کی آیت ۸۶ کے ذیل میں نکات کے عنوان سے لکھتے ہیں: " ان آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں میں شمار کیا گیا ہے حالانکہ وہ حضرت ابراہیم کی دختر کے بیٹے ہیں، اس سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ دختر زادے بھی انسان کے فرزند شمار ہوتے ہیں۔ بنی اُمیہ اور بنی عباس اس بات پر پریشان تھے کہ حضرت امام حسن، امام حسین اور ائمہ علیہم السلام کو رسول اللہ ﷺ کے فرزند کہا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ کہتے تھے چونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی بیٹی کے بیٹے ہیں لہٰذا اُنھیں "ابن رسول اللہ" نہیں کہا جا سکتا اور یہ اس وقت صحیح تھا کہ جب وہ آنحضرت ﷺ کے (صلبی) بیٹے ہوتے، لیکن یہ آیہ شریفہ ان کی اس بات کو رد کرتی ہے۔
تفسیر عیاشی میں منقول ہے کہ حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن معمر کے پیچھے ایک مامور بھیجا، جب یحییٰ آیا تو حجاج نے کہا: مجھے بتایا گیا ہے کہ تم کہتے ہو حسن و حسین (علیہما السلام) پیغمبر ﷺ کے بیٹے ہیں کیا تم یہ بات قرآن سے ثابت کر سکتے ہو؟ میں نے تو قرآن کو اول سے آخر تک پڑھا ہے، اس میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے! یحییٰ نے کہا: کیا تم نے سورۂ انعام میں نہیں پڑھا: "وَمِن ذُرِّيَّتِهِ داوُدَ وَسُلَيمانَ... وَيَحيي وَعِيسي"! کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزندان میں سے نہیں تھے حالانکہ اُن کوئی باپ نہیں تھا۔ حجاج نے کہا: تم نے درست کہا ہے۔ جی ہاں! بنی اُمیہ اور بنی عباس، (اہل بیت اطہارؑ) کی

شخصیت کو دبانے کی فکر میں رہتے تھے تاکہ اُنہیں (سیاسی) منظر سے ہٹا سکیں لیکن وہ خود ہی ذلیل ورسوا ہوگئے۔ یہ مسئلہ (علامہ امینیؒ کی کتاب) ''الغدیر''میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔(7)

4) محمد بن حسن المعروف شیخ طوسیؒ متوفی ۴۶۰ھ

شیخ طوسیؒ، التبیان فی تفسیر القرآن میں سورہ انعام کی آیت ۸۵ کے ذیل میں لکھتے ہیں :'' ثم قال ''وإسماعيل واليسع ويونس ولوطا ''فعطفهم على قوله ''ونوحا هدينا '' وفي الآية دلالة على أن الحسن والحسين من ولد رسول الله صلى الله عليه وآله، لان عيسى جعله الله من ذرية إبراهيم أو نوح، وإنما كانت أمه من ذريتهما، ''(8) یعنی: "پھر فرمایا: ''اسماعیلؑ ،یسعؑ ،یونسؑ اور لوطؑ ''اور انہی پر عطف کیا''ابراہیمؑ اور نوحؑ''کو لہٰذا یہ آیت دلیل ہے کہ حسنؑ وحسینؑ، رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے قرار دیا ہے اور فقط اُن کی والدہ ہی ان دونوں انبیاء کی ذریت میں سے تھیں (یعنی اُن کے باپ تو تھے نہیں لہٰذا وہ اپنی والدہ کی جانب سے ذریت ابراہیمؑ کہلائے ہیں پس جس طرح حضرت عیسیٰ نبیؑ ،ماں کی جانب سے ذریت ابراہیمؑ ہیں اسی طرح حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام بھی اپنی ماں حضرت فاطمہؑ کی طرف سے ذریت رسول ﷺ ہیں)۔"

اس کے بعد شیخ طوسی اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ جس میں سورہ احزاب کی آیت ۴۰ کو پیش کرکے یہ کہا جاتا ہے کہ اس آیت کے مطابق تو رسول اللہ ﷺ کسی مرد کے باپ نہیں ہیں، لہٰذا وہ کیسے حضرات حسنین شریفین علیہما السلام کے باپ ہو سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں وہ سورۂ احزاب کی آیت ۴۰ کے ذیل میں لکھتے ہیں:''وهي قوله ﴿ ما كان محمد أبا أحد من رجالكم ﴾ على أنه لم يكن الحسن والحسين عليهما السلام ابنيه، فقد أبعد، لان الحسن والحسين كانا طفلين، كما أنه كان أبا إبراهيم وإنما بقي أن لا يكون أبا للرجال البالغين.''(9) یعنی: "اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ''حضرت محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں''تو حسنؑ وحسینؑ بھی آپ ﷺ کے بیٹے نہیں ہو سکتے، لیکن یہ بات بہت ہی بعید ہے کیونکہ حسن وحسین اُس وقت فقط (نابالغ) بچے تھے، مرد نہیں تھے جیسا کہ وہ ابراہیم کے باپ تھے، آپؐ فقط بالغ مردوں کے باپ نہیں تھے۔ یعنی رجل بالغ مرد کے لئے استعمال ہوتا ہے نہ نابالغ بچے کے لئے۔"

5) محمد بن علی بن محمد الشوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ

مشہور مفسر شوکانی، اپنی تفسیر "فتح القدیر" ج ۲ میں سورۂ انعام کی آیت ۸۹ کے ذیل میں لکھتے ہیں: "وَقَدْ أَخْرَجَ ابْنُ أَبِي حَاتِمٍ وَأَبُو الشَّيْخِ عن مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبٍ قَالَ: الْخَالُ وَالِدٌ وَالْعَمُّ وَالِدٌ. نَسَبَ اللَّهُ عِيسَى إِلَى أَخْوَالِهِ فَقَالَ: وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ حَتَّى بَلَغَ إِلَى قَوْلِهِ: وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَى وَعِيسى. وَأَخْرَجَ أَبُو الشَّيْخِ وَالْحَاكِمُ وَالْبَيْهَقِيُّ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ قَالَ: دَخَلَ يَحْيَى بْنُ يَعْمَرَ عَلَى الْحَجَّاجِ فَذَكَرَ الْحُسَيْنَ. فَقَالَ الْحَجَّاجُ: لَمْ يَكُنْ مِنْ ذُرِّيَّةِ النَّبِيِّ. فَقَالَ يَحْيَى: كَذَبْتَ. فَقَالَ: لَتَأْتِيَنِّي عَلَى مَا قُلْتَ بِبَيِّنَةٍ. فَتَلَا وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ إِلَى قَوْلِهِ: وَعِيسى فَأَخْبَرَ اللَّهُ أَنَّ عِيسَى مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ بِأُمِّهِ. فَقَالَ: صَدَقْتَ. وَأَخْرَجَ ابْنُ أَبِي حَاتِمٍ عَنْ أَبِي حَرْبِ بْنِ أَبِي الْأَسْوَدِ قَالَ: أَرْسَلَ الْحَجَّاجُ إِلَى يَحْيَى بْنِ يَعْمَرَ فَقَالَ: بَلَغَنِي أَنَّكَ تَزْعُمُ أَنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ النَّبِيِّ. تَجِدُهُ فِي كِتَابِ اللَّهِ. وَقَدْ قَرَأْتُهُ مِنْ أَوَّلِهِ إِلَى آخِرِهِ فَلَمْ أَجِدْهُ؟ فَذَكَرَ يَحْيَى بْنُ يَعْمَرَ نَحْوَ مَا تَقَدَّمَ." (10)

یعنی: " امام ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے محمد بن کعب سے روایت کی ہے کہ ماموں اور چچا بھی والد ہوتا ہے، (چونکہ) اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے ماموں سے نسبت دی ہے اور فرمایا ہے" وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ "یہاں تک کہ فرمایا: " وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَى وَعِيسى "۔ابو شیخ، حاکم اور بیہقی نے عبدالملک بن عمیر سے نقل کیا ہے کہ اُس نے کہا: یحییٰ بن یعمر حجاج کے پاس آیا تو وہاں حسینؑ کا تذکرہ ہوا تو حجاج نے کہا وہ نبی اکرم ﷺ کی ذریت (اولاد) سے نہیں ہیں۔تو یحییٰ نے (جواب میں) کہا: تم نے جھوٹ بولا ہے، اس پر حجاج نے کہا: تم جو کہتے ہو اس پر کوئی دلیل لاؤ۔پس اُس نے آیہ مجیدہ "وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ" تا "وعیسیٰ "کی تلاوت کی۔پس اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اُن کی ماں کے ذریعے حضرت آدمؑ کی ذریت میں سے قرار دیا ہے، اس وقت حجاج نے کہا: تو نے سچ کہا ہے۔اور ابن ابی حاتم نے ابو حرب بن ابو الاسود سے روایت کی ہے کہ: حجاج نے یحییٰ بن یعمر کے پاس مامور بھیجا اور کہا کہ تم خیال کرتے ہو حسن و حسین (علیہما السلام) ذریت نبی ﷺ میں سے ہیں کیا تم اس بات کو کتاب خدا میں پاتے ہو جبکہ میں نے کتاب خدا کو اول سے آخر تک پڑھا ہے، میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں دیکھی پس یحییٰ بن یعمر نے وہی کچھ کہا جو پہلے گذر چکا ہے۔"

6) علامہ محمد جواد مغنیہ مرحوم متوفی ۱۴۰۰ھ

محمد جواد مغنیہ، "تفسیر الکاشف" میں سورۂ آل عمران کی آیت ۶۱ کے ذیل میں عنوان "اهل البيت" کے تحت لکھتے ہیں: "ومما قاله الرازي في تفسير آية المباهلة: «روي أن محمد (ص) لما خرج في المرط الأسود،

فجاء الحسن رضي الله عنه فأدخله ، ثم جاء الحسين رضي الله عنه فأدخله ، ثم فاطمة ، ثم علي رضي الله عنهما ، ثم قال النبي (ص) : (إِنَّما يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ ويُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيراً) واعلم ان هذه الرواية كالمتفق على صحتها بين أهل التفسير والحديث ثم قال الرازي : ان هذه الآية دالة على ان الحسن والحسين عليهما السلام كانا ابني رسول الله (ص) ، وعد أن يدعو أبناءه فدعا الحسن والحسين ، فوجب أن يكونا ابنيه ، ومما يؤكد هذا قوله تعالى في سورة الانعام : (وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ داوُدَ وسُلَيْمانَ) إلى قوله : (وزَكَرِيَّا ويَحْيى وعِيسى) ومعلوم ان عيسى (ع) انما انتسب إلى إبراهيم (ع) بالأم لا بالأب "

یعنی: " فخر رازی نے آیہ مباہلہ کی تفسیر میں کہا ہے: منقول ہے کہ جب حضرت محمد ﷺ سیاہ رنگ کی بغیر سلی چادر کے ساتھ باہر آئے تو حسنؑ آئے پس نبی اکرم ﷺ نے اُنھیں اپنی چادر کے نیچے لے لیا، اس کے بعد جب حسینؑ آئے تو نبی اکرم ﷺ نے اُنھیں بھی چادر کے نیچے لے لیا، اس کے بعد فاطمہؑ اور علیؑ آئے تو پھر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: " إِنَّما يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ ويُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيراً "۔

جان لو کہ یہ روایت ،اُن روایات میں سے ہے کہ جن کے صحیح ہونے کے بارے میں مفسرین اور محدثین اتفاق نظر رکھتے ہیں۔ اس کے بعد فخر رازی کہتے ہیں: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ حسن اور حسین (علیہما السلام) رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے وعدہ کیا ہے کہ اپنے بیٹوں کو بلائیں، پس حسنؑ اور حسینؑ کو بلایا۔ لہذا ان دونوں کو رسول اللہ ﷺ کے فرزند ہونا چاہیے۔ اس بات کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس کلام سے بھی ہوتی ہے جو اس نے سورۂ انعام میں فرمایا ہے: " وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ داوُدَ وسُلَيْمانَ" تا " وزَكَرِيَّا ويَحْيى وعِيسى" اور واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فقط اپنی ماں کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب ہیں نہ باپ کی طرف سے۔ (11)

اس کے بعد علامہ جواد مغنیہؒ سورۂ انعام کی ۸۴ کے ذیل میں "الحسن والحسين ابنا رسول الله " کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں : "قال الرازي في تفسير هذه الآية : انها تدل على ان الحسن والحسين من ذرية رسول الله (ص) لأن الله تعالى جعل عيسى من ذرية إبراهيم ، مع انه لا ينتسب إلى إبراهيم إلا بالأم ، فكذلك الحسن والحسين من ذرية رسول الله ، وان انتسبا إليه بالأم . . . . .

أما السر في ان الحسن والحسين ابنا رسول الله ، مع انهما ليسا من أبنائه لغة . أما هذا السر فيجده الباحث في صفات الحسنين وشمائلهما ، انها عين صفات الرسول الأعظم وشمائله . . وحسب الباحث من سيرة الحسن ان معاوية بن

أبي سفيان لم يسعه الملك الذي كان فيه ، وفي الحسن عرق ينبض ، وحسب الباحث من سيرة الحسين ان يزيد بن معاوية ضاقت به الدنيا مع وجود الحسين ، كما ضاقت بأبيه معاوية من قبل ، مع وجود الحسن . "(12)
یعنی: "فخر رازی نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے: یہ آیت حسن و حسین علیہما السلام کے ذریت نبی ﷺ ہونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں سے قرار دیا ہے حالانکہ وہ فقط ماں کی جانب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ منسوب ہیں۔ اسی طرح حسن و حسین علیہما السلام بھی ماں کی جانب سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ منسوب ہیں۔ کہتے ہیں ابو جعفر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے حجاج بن یوسف کے سامنے اسی آیت سے استدلال کیا تھا۔
صاحب تفسیر المنار کہتے ہیں: ہم کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں حدیث ابوبکرہ نقل ہوئی ہے کہ جو بخاری کی نظر میں مرفوع حدیث ہے: پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "ان ابني هذا سيد يعني الحسن" یعنی: میرا یہ بیٹا سید ہے۔ جس سے مراد حضرت امام حسنؑ ہیں۔ اور کلمہ "ابن" عربوں کے نزدیک بیٹی کے بیٹوں کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ اسی طرح کتاب معرفۃ الصحابہ میں حدیث عمر ہے کہ جو ابو نعیم سے مرفوعاً نقل ہوئی ہے: تمام اولاد آدم کی نسبت باپ کی طرف سے ہوتی ہے سوائے فاطمہؑ کی اولاد کے کہ میں ان کا باپ ہوں۔ لوگ بھی اسی حدیث کے مطابق عمل کرتے تھے اور حضرت فاطمہؑ کے بیٹوں کو رسول اللہ ﷺ کے بیٹے اور آپ ﷺ کی عترت اور اہل بیتؑ کے عنوان سے یاد کرتے تھے۔
اس بات کا مطلب یہ ہے کہ لغوی اعتبار سے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے بیٹے رسول اللہ ﷺ کے بیٹے شمار نہیں ہوتے، لیکن شرعی لحاظ سے وہ رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہیں۔ کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " أنا أبوهم وعصبتهم " یعنی: میں ان کا باپ ہوں اور وہ مجھ سے منسوب ہیں۔ اسی طرح وہ (حسن وحسین) عرف کی نظر میں بھی رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہیں کیونکہ لوگوں کی عادت ہے کہ وہ جناب فاطمہؑ کے بیٹوں کو "ابن رسول اللہ اور عترت واہل بیت رسول" کہتے تھے۔ شیعہ اور سنی علما اس بات پر متفق ہیں کہ الفاظ کے معانی کے بارے میں لغت اور عرف پر شرع مقدم ہے، کیونکہ شارع حکیم، لوگوں کو اُسی چیز سے مخاطب کرتی ہے کہ جو اُن کے اذہان میں تبادر کرتی ہے نہ اس چیز سے کہ جو لغت اور فرہنگ ناموں میں لکھی جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی لفظ کسی آیت یا روایت میں آیا ہو اور ہم اس لفظ کے معنیٰ کے لئے کتاب وسنت میں کوئی خاص تفسیر پالیں تو یہ لفظ اسی خاص معنیٰ پر حمل کیا جائے گا اور عرفی اور لغوی معنیٰ کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اور اگر اس لفظ کے لئے کتاب وسنت میں ہمیں کوئی خاص تفسیر نہیں

ملتی تو اُسے ہمیں اسی معنیٰ پر حمل کرنا چاہیے کہ جس پر لوگ اُسے حمل کرتے اور سمجھتے ہیں، اسی کو عرفی معنیٰ کہتے ہیں۔ اور اگر لوگوں کو اس سے کوئی خاص معنیٰ سمجھ نہ آیا تو پھر اسے لغت اور فرھنگ ناموں میں لکھے گئے معانی پر حمل کرنا پڑے گا۔

بنابریں سب سے پہلے شرعی معنیٰ، اس کے بعد عرفی معنیٰ اور تیسرے مرحلے میں لغوی معنیٰ قرار پاتا ہے۔ شرعی اور عرفی لحاظ سے ثابت ہے کہ حسن و حسین علیہما السلام رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہیں پس ہمیں یہی معنیٰ لینا چاہیے اور لغوی معنیٰ کو چھوڑ دینا چاہیے چونکہ شرع اور عرف لغت پر حاکم ہیں۔

البتہ حسن و حسین علیہما السلام کے رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ لغوی اعتبار سے آپ ﷺ کے بیٹے نہیں ہیں لیکن ہر محقق یہ نکتہ سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں شہزادوں کی صفات بعینہٖ رسول اللہ ﷺ کی صفات ہیں۔ سیرت امام حسین علیہ السلام کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کے لئے یہی بات کافی ہے، اُن کے ہوتے ہوئے یزید بن معاویہ پر دنیا تنگ ہو گئی تھی جس طرح امام حسن علیہ السلام کی موجودگی میں یزید کے باپ پر دنیا تنگ ہو چکی تھی۔" (13)

7) فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ

فخر الدین رازی اپنی " التفسیر الکبیر (مفاتیح الغیب)" میں سورہ آل عمران کی آیت ۶۱ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"الْمَسْأَلَةُ الرَّابِعَةُ: هَذِهِ الْآيَةُ دَالَّةٌ عَلَى أَنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ كَانَا ابْنَيْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَعَدَ أَنْ يَدْعُوَ أَبْنَاءَهُ، فَدَعَا الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ، فَوَجَبَ أَنْ يَكُونَا ابْنَيْهِ، وَمِمَّا يُؤَكِّدُ هَذَا قَوْلُهُ تَعَالَى فِي سُورَةِ الْأَنْعَامِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ داوُدَ وَسُلَيْمانَ [الْأَنْعَامِ: 84] إِلَى قَوْلِهِ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيى وَعِيسى [الْأَنْعَامِ: 85] وَمَعْلُومٌ أَنَّ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ إِنَّمَا انْتَسَبَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالْأُمِّ لَا بِالْأَبِ، فَثَبَتَ أَنَّ ابْنَ الْبِنْتِ قَدْ يُسَمَّى ابْنًا وَاللَّهُ أَعْلَمُ. " (14)

یعنی: "چوتھا مسئلہ: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ حسن و حسین (علیہما السلام) رسول اللہ ﷺ کے بیٹے تھے کیونکہ قرار یہ تھا کہ آپ ﷺ نے اُنھیں اپنے بیٹوں کے عنوان سے بلائیں، پس آپ ﷺ نے حسن و حسین کو بلایا۔ پس ضروری ہے وہ آپ ﷺ کے بیٹے ہی ہوں۔ اسی مطلب پر سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی تاکید کرتا ہے جس میں فرمایا: "وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ داوُدَ وَسُلَيْمانَ" تا" وَزَكَرِيَّا وَيَحْيى وَعِيسى "اور یہ واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ فقط ماں کی طرف سے منسوب ہیں نہ باپ کی جانب سے۔ پس ثابت ہو گیا کہ بیٹی کا بیٹا بھی بیٹا ہی کہلاتا ہے۔ واللہ اعلم۔"

پھر فخر الدین رازی سورہ انعام کی آیت ۸۶ کے ذیل میں لکھتے ہیں: " الْمَسْأَلَةُ الْخَامِسَةُ: الْآيَةُ تَدُلُّ عَلَى أَنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ رَسُولِ اللَّه صلّى اللّه عليه وآله وَسَلَّمَ ، لِأَنَّ اللَّه تَعَالَى جَعَلَ عِيسَى مِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ مَعَ أَنَّهُ لَا يَنْتَسِبُ إِلَى إِبْرَاهِيمَ إِلَّا بِالْأُمِّ . فَكَذَلِكَ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ رَسُولِ اللَّه صَلَّى اللّه عليه وآله وسلّم ، وإن انْتَسَبَا إِلَى رَسُولِ اللَّه بِالْأُمِّ وَجَبَ كَوْنُهُمَا مِنْ ذُرِّيَّتِهِ ، وَيُقَالُ: إِنَّ أَبَا جَعْفَرٍ الْبَاقِرَ اسْتَدَلَّ بِهَذِهِ الْآيَةِ عِنْدَ الْحَجَّاجِ بْنِ يُوسُفَ. "(15) یعنی: "پانچواں مسئلہ: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ حسن و حسین، رسول اللہ ﷺ کی ذریت اور اولاد میں سے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں سے قرار دیا ہے حالانکہ وہ فقط ماں کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ سے منسوب تھے، پس اسی طرح حسن و حسین (علیہما السلام) بھی رسول اللہ ﷺ کی ذریت ہیں، کیونکہ یہ دونوں ماں کی جانب سے رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہیں پس ان کو دونوں کو بھی آپ ﷺ کی ذریت ہونا چاہیے۔ جیسا کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے حجاج کے سامنے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔"

8) فضل بن حسن طبرسی (متوفی ۵۴۸ق)

شیخ طبرسی، مجمع البیان فی تفسیر القرآن میں سورۂ انعام کی آیت ۸۵ کے ذیل میں لکھتے ہیں: " وإذا جعل الله سبحانه عيسى من ذرية إبراهيم (عليه السلام) أو نوح ففي ذلك دلالة واضحة وحجة قاطعة على أن أولاد الحسن والحسين (عليهما السلام) ذرية رسول الله (صلى الله عليه وآله وسلّم) على الإطلاق وإنهما ابنا رسول الله (صلى الله عليه وآله وسلّم) وقد صح في الحديث أنه قال لهما (عليهما السلام) ابناي هذان إمامان قاما أو قعدا وقال للحسن (عليه السلام) أن ابني هذا سيد وإن الصحابة كانت تقول لكل منهما ومن أولادهما يا ابن رسول الله "یعنی: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں سے قرار دیا ہے تو یہ اس بات کی واضح دلیل اور قاطع حجت ہے کہ حسن و حسین علیہما السلام کی اولاد بطور مطلق رسول اللہ ﷺ کی ذریت ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں (شہزادے) رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہیں اور صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان دونوں (حسن و حسین علیہما السلام) کے لئے فرمایا: یہ دونوں میرے بیٹے امام ہیں خواہ قیام کریں یا قیام نہ کریں۔ اور امام حسن علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: میرا یہ بیٹا سید و سردار ہے۔ اور صحابہ کرامؓ ان دونوں کے لئے اور ان کی اولاد کے لئے: "یابن رسول اللہ" (اے رسول اللہ کے بیٹے) کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔(16)

9) وہبۃ بن مصطفیٰ الزحیلی الدمشقی متوفی ۲۰۱۵ء

''التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنہج'' کے مؤلف وہبۃ بن مصطفیٰ الزحیلی، سورہ آل عمران کی آیت ۶۱ کے ذیل میں لکھتے ہیں: '' ودلّ قوله تعالى: نَدْعُ أَبْناءَنا وَأَبْناءَكُمْ ،وقوله صلّى الله عليه وسلّم في الحسن: ''إنّ ابني هذا سيّد'' (17)على خصوصية تسمية الحسن والحسين: ابني النّبي صلّى الله عليه وسلّم دون غيرهما ،لقوله عليه الصلاة والسلام: ''كل سبب ونسب ينقطع يوم القيامة إلا نسبي وسببي'' (18)،(19)

یعنی ؛نبی اکرم ﷺ کا حسن بن علیؑ کے بارے میں فرمان ہے کہ میرا یہ بیٹا سید ہے۔ خصوصا! حسن و حسین کو ہی نبی اکرم ﷺ کے بیٹے کہا جاتا ہے کسی اور کو نہیں۔چونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے ''قیامت کے دن ہر رشتہ اور نسب منقطع ہو جائے گا سوائے میرے نسب اور رشتے کے۔

پھر تفسیر المنیر کے مؤلف سورۂ انعام کی آیت ۸۶ کے ذیل میں لکھتے ہیں: '' وفي ذكر عيسى عليه السلام في ذرية إبراهيم، أو نوح على القول الآخر دلالة على دخول ولد البنات في ذرية الرجل لأن عيسى عليه السلام إنما ينسب إلى إبراهيم عليه السلام من طريق أمه «مريم» فإنه لا أب له. ومثل ذلك دخول الحسن والحسين رضي الله عنهما في ذرية النّبي صلّى الله عليه وسلّم وهما أولاد فاطمة رضي الله عنها لما ثبت في صحيح البخاري أن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال للحسن بن علي: «إن ابني هذا سيد، ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين''۔فسماه ابنا، فدل على دخوله في الأبناء ''۔(20)

یعنی: '' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم یا حضرت نوح علیہما السلام کی ذریت میں ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بیٹوں کا بیٹا بھی انسان کی ذریت میں سے ہوتا ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فقط اپنی ماں حضرت مریم علیہا السلام کی جانب سے حضرت ابراہیمؑ سے منسوب تھیں چونکہ اُن کے والد نہیں تھے۔اسی طرح حسن اور حسین رضی اللہ عنہما بھی ذریت النبی ﷺ میں داخل ہیں جبکہ وہ دونوں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ہیں جیسا کہ صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسن بن علی کے بارے مین فرمایا: میرا یہ بیٹا سید وسردار ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کو بیٹا کہا ہے، پس وہ (نبی اکرم ﷺ) کے بیٹوں میں سے ہیں۔

10) علامہ محمد حسین طباطبائی متوفی ۱۹۸۱ء

علامہ طباطبائی " المیزان فی تفسیر القرآن " سورۂ انعام ۸۵ کے ذیل میں لکھتے ہیں : " قوله تعالى: (وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَى وَعِيسَى وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ) تقدّم الكلام في معنى الإحسان و الصلاح فيما سلف من المباحث و في ذكر عيسى بين المذكورين من ذرّيّة نوح عليهما السلام و هو إنّما يتّصل به من جهة أُمّه مريم دلالة واضحة على أنّ القرآن الكريم يعتبر أولاد البنات و ذرّيّتهن أولاداً و ذرّيّة حقيقة، و قد تقدّم استفادة نظير ذلك من آية الإرث و آية محرّمات النكاح. و للكلام تتمّة ستوافيك في البحث الروائيّ الآتي إن شاء الله تعالى " ۔(21)

یعنی ؛ہم نے آیہ مجیدہ: "وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَى وَعِيسَى وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ " (کے ذیل میں) گزشتہ مباحث میں " احسان " و " صلاح " کے بارے میں بحث کی ہے۔ یہ جو قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ذریت نوحؑ میں شمار ہونے والوں میں سے قرار دیا ہے تو اس سے یہ بات واضح طور پر سمجھ آتی ہے کہ قرآن کریم بیٹی کی اولاد کو بھی حقیقی ذریت جانتا ہے۔ چونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہ جو فقط ماں کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام سے متصل ہوتے ہیں ،ذریت نوح میں سے نہ کہا جاتا۔ نیز اسی قسم کی بات ارث اور محرمات نکاح کی سابقہ آیات سے بھی سمجھی جاسکتی ہے۔ البتہ اس باب میں کچھ اور مطالب بھی ہیں جو انشاء اللہ آئندہ روائی بحث میں بیان کئے جائیں گے۔"

پھر اسی آیت کی " بحث روائی "میں علامہ طباطبائیؒ "اسلام کا بیٹیوں کی اولاد کو ذریت قرار دینا" کے عنوان سے لکھتے ہیں : " و في الكافي، مسنداً و في تفسير العيّاشيّ، مرسلاً عن بشير الدهّان عن أبي عبدالله عليه السلام قال: و الله لقد نسب الله عيسى بن مريم في القرآن إلى إبراهيم من قبل النساء ثمّ تلا: (وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ) إلى آخر الآية و... و أُورد عليه: أنّه ليس له أب يصرف إضافته إلى الأُمّ إلى نفسه فلا يظهر قياس غيره عليه في كونه ذرّيّة لجده من الأُمّ و تعقّب بأنّ مقتضى كونه بلا أب أن يذكر في حيّز الذرّيّة. و فيه منع ظاهر و المسألة خلافيّة، و الذاهبون إلى دخول ابن البنت في الذرّيّة يستدلّون بهذه الآية، و بها احتجّ موسى الكاظم رضي الله عنه على ما رواه البعض عند الرشيد۔" (22)

یعنی: " کافی میں سند کے ساتھ اور تفسیر عیاشی میں بغیر سند کے بشیر بن دہان نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نسب کو ماں کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب قرار دیا ہے اس کے بعد امام علیہ السلام نے آیہ مجیدہ : " وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ " کی آخر تک اور بعد والی آیت کی لفظ "عیسیٰ "تک تلاوت فرمائی۔

تفسیر عیاشی میں ابی حرب ، ابی الأسود سے روایت کی گئی ہے کہ حجاج نے ایک مامور کو یحییٰ بن معمر کے پاس بھیجا کہ میں نے سنا ہے تو حسن و حسین کو رسول اللہ ﷺ کے بیٹوں میں سے قرار دیتا ہے، کیا تمہارے پاس قرآن کی آیات میں سے کوئی دلیل ہے ؟ حالانکہ میں نے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھا ہے مجھے تو کوئی ایسی بات نہیں ملی ؟ یحییٰ بن یعمر نے جواب میں کہا : کیا تم نے سورۂ انعام کو پڑھا اور اس میں یہ آیت پڑھی ہے کہ جس میں فرمایا ہے : " وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ داوُدَ وَسُلَيْمانَ "؟ (حجاج نے) کہا : ہاں میں نے یہ آیت پڑھی ہے۔ یحییٰ نے کہا : کیا ایسا نہیں کہ اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں قرار دیا گیا ہے حالانکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کی اولاد میں سے نہیں تھے ؟

مؤلف : اسی روایت کو سیوطی نے نیز " الدر المنثور " (4) میں ابن ابی حاتم اور ابی الحرب بن ابی الأسود سے نقل کیا ہے۔اسی طرح الدر المنثور میں ہی ہے کہ ابو الشیخ و حاکم و بیہقی نے عبد الملک بن عمیر سے نقل کیا ہے کہ ایک دن یحییٰ بن معمر حجاج کے پاس آیا تو اس کے ساتھ گفتگو کے دوران حسین بن علی (علیہ السلام) کا تذکرہ ہو تو حجاج نے کہا : حسین بن علی ذریت پیغمبرؐ میں سے نہیں ہیں۔ یحییٰ نے جواب میں کہا : تم جھوٹ کہتے ہو، تو حجاج نے کہا اگر تم سچ کہتے ہو تو دلیل بیان کرو۔ اس وقت یحییٰ نے یہ آیت تلاوت کی : (وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ داوُدَ وَسُلَيْمانَ ۔۔۔ وَعِيسى وَإِلْياسَ) ۔اور پھر کہا : اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماں کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ منسوب ہونے کے باوجود، اُن کی ذریت میں قرار دیا ہے۔ (اس وقت) حجاج کو مجبوراً اُس کی اس بات قبول کرنا پڑی۔

مؤلف : آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں " و عیسی۔۔۔الخ کے ذیل میں کہا ہے : یہ جو قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں شمار کیا ہے خود اس بات کی دلیل ہے کہ ذریت بیٹی کی اولاد کو بھی کہتے ہیں۔چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے والد نہیں تھے، وہ فقط ماں کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب اور متصل ہیں نہ کہ باپ کی طرف سے۔اور اگر کو اعتراض کرے کہ ہر بیٹی کی اولاد ذریت ہوتی ہے بلکہ فقط حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی والد نہ ہونے کی وجہ سے (ماں کی طرف سے) حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب ہیں۔ اور یہ بھی اس لئے کہ قرآن مجید نے اُنہیں ذریت ابراہیمؑ میں سے قرار دیا ہے۔اسکا جواب بالکل واضح ہے البتہ اس مسئلے کے بارے مین اختلاف نظر پایا

جاتا ہے لیکن جس نے بھی بیٹی کے بیٹوں کو ذریت قرار دیا ہے، اُس نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ جیسا کہ بعض روایات کے مطابق حضرت امام موسی کاظمؑ نے ہارون الرشید کے جواب میں اسی آیہ مجیدہ سے استدلال کیا ہے۔"

اس کے بعد علامہ طاطبائیؒ نے تفسیر کبیر میں سے فخر رازی کے استدلال کو نقل کیا اور حجاج کا واقعہ ذکر کیا اور اس سلسلے میں خود علامہ فخر رازی کی نظریہ بھی نقل کیا جس کے مطابق بیٹی کی اولاد بھی ذریت میں شامل ہے۔(23)

11) شیخ محسن قرائتی متولد ۱۹۴۶ء

شیخ محسن قرائتی تفسیر نور آیت ۸۵ تا ۸۷ کے ذیل میں لکھتے ہیں: "ذریت" اس اولاد کو کہتے ہیں جو باپ کی طرف سے کسی انسان کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ کے والد نہیں تھے اور وہ صرف ماں کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب تھے لیکن اس آیت میں انہیں بھی ابراہیم کی ذریت میں شمار کیا گیا (ومن ذریۃ۔۔۔وعیسیٰ)۔

روایات میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہم السلام نے بھی اسی آیت کو سند بنا کر اہلبیت اطہار علیہم اسلام کو جو ماں کی طرف سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جا پہنچتے ہیں ذریت رسول اور اولاد رسول بتایا ہے۔ (تفسیر نورالثقلین جلد اول ص ۷۴۳۔) اور فخر رازی نے بھی اپنی تفسیر جلد ۱۳ ص ۶۶ میں اسی نکتہ کو قبول کیا ہے۔ اور صحیح بخاری میں بھی حضرت ابوبکر سے منقول ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی "ذریت" کا لفظ حضرت امام حسن علیہ السلام کے لئے استعمال کیا ہے۔"(24)

12) آیت اللہ مکارم شیرازی متولد ۱۳۴۵ھ

تفسیر نمونہ کے مفسرین سورۂ آل عمران کی آیت ۶۱ کے ذیل میں لکھتے ہیں: "شیعہ اور سنی مفسرین اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ "آیۂ مباہلہ" اہل بیتِ رسولؐ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور رسول (ﷺ) جن افراد کو اپنے ہمراہ وعدہ گاہ کی طرف لے گئے تھے وہ صرف ان کے بیٹے امام حسن (علیہ السلام) اور امام حسین (علیہ السلام)، ان کی بیٹی فاطمہ زہرا (علیہا السلام) اور حضرت علی علیہ السلام تھے، اس بناء پر آیت میں "ابنائنا" سے مراد صرف امام حسن (علیہ السلام) اور

حسین (علیہ السلام) ہیں۔" نسائنا" سے مراد جناب فاطمہ (علیہ السلام) ہیں اور " انفسنا " سے مراد صرف حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل ہوئی ہیں۔اہل سنت کے بعض مفسرین جو بہت کم تعداد میں ہیں اس سلسلے میں وارد ہونے والی احادیث کا انکار کرنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً مؤلفِ " المنار" نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے : یہ تمام روایات شیعہ طریقوں سے مروی ہیں۔اس کا مقصد معین ہے۔انہوں نے ان احادیث کی نشر و اشاعت اور ترویج کی کوشش کی ہے ، جس سے بہت سے علماء اہل سنت کو بھی اشتباہ ہو گیا ہے۔

لیکن اہل سنت کی بنیادی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے تو وہ نشاندھی کرتی ہیں کہ ان میں سے بہت سے طریقوں کا شیعوں یا ان کی کتابوں سے ہر گز کو تعلق نہیں اور اگر اہل سنت کے طریقوں سے مروی ان احادیث کا انکار کیاجائے تو ان کی باقی احادیث اور کتب بھی درجۂ اعتبار سے گر جائیں گی۔ اس حقیقت کو زیادہ واضح کرنے کے لئے اہل سنت کے طریقوں سے کچھ روایات ہم یہاں پیش کریں گے۔قاضی نو ر اللہ شوستری اپنی کتابِ نفیس " احقاق الحق " کی جلد سوم طبع جدید صفحہ ۴۶ پر لکھتے ہیں:

" مفسرین اس سلسلے میں متفق ہیں کہ " ابنائنا "سے اس آیت میں امام حسن (علیہ السلام) اور امام حسین (علیہ السلام) مراد ہیں ، " نسائنا" سے حضرت فاطمہ (علیہ السلام) مراد ہیں اور " انفسنا" میں حضرت علی (علیہ السلام) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔" اس کے بعد کتاب مذکور کے حاشیہ پر تقریباًساٹھ بزرگان اہل سنت کی فہرست دی گئی ہے جنہوں نے تصریح کی ہے کہ آیت مباہلہ اہل بیتِ رسول کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ان کے نام اور ان کی کتب کی خصوصیات صفحہ ۴۶ سے لے کر صفحہ ۷۶ تک تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔(25)

" غایۃ المرام " میں " صحیح مسلم " کے حوالے سے لکھا ہے :ایک روز معاویہ نے سعد بن ابی اقاص سے کہا : تم ابو تراب،(علی (علیہ السلام) کو سب و شتم کیوں نہیں کرتے۔وہ کہنے لگا :جب علی (علیہ السلام) کے بارے میں پیغمبر کی کہی ہوئی تین باتیں مجھے یاد آئی ہیں ، میں نے اس کام سے صرف نظر کرلیا ہے۔ان میں سے ایک یہ تھی کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو پیغمبر نے صرف

فاطمہ (علیہ السلام) حسن (علیہ السلام) اور حسین(علیہ السلام) اور علی (علیہ السلام) کو دعوت دی۔ اس کے بعد فرمایا" اللھم ھٰولاء اھلی " یعنی خدایا ! یہ میرے نزدیکی اور خواص ہیں۔

بیٹی کی اولاد

آیہ مباہلہ سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیٹی کی اولاد کو بھی " ابن " (بیٹا) کہا جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اس کے بر عکس مرسوم تھا کہ صرف بیٹے کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھا جاتا اور کہا جاتا تھا کہ:

بنونا بنو ابنائنا وبناتنا　　بنوھنّ ابناء الرجال الاّباعد

یعنی ہماری اولاد تو فقط ہمارے پوتے ہیں رہے ہمارے نواسے تو وہ دوسروں کی اولاد ہیں نہ کہ ہماری۔ بیٹوں اور عورتوں کو انسانی معاشرے کا حقیقی حصّہ سمجھنے کی طرز فکر بھی اسی غلط سنّتِ جاہلیت کی پیدا وار تھی۔ وہ عورتوں کو اپنی اولاد کی نگہدارہ کے لئے فقط ظرف سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ان کے شاعر نے کہا ہے:

ے و انّما امّھات الناس اوعیة مستودعات و للانساب آباء

یعنی: "لوگوں کی مائیں ان کی پرورش کے لئے ظرف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور نسب کے لئے تو صرف باپ ہی پہچانے جاتے ہیں۔ اسلام نے اس طرز فکر کی شدید نفی کی اور اولاد کے احکام پوتوں اور نواسوں پر ایک ہی طرح سے جاری کئے۔ سورہ انعام آیہ ۸۴ اور ۸۵ میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد کے بارے میں ہے :'' ومن ذرّیّته داود و سلیمان و ایّوب و یوسف و موسیٰ و ھارون و کذالک نجزی المحسنین و زکریا و یحییٰ و عیسیٰ و الیاس کلّ من الصالحین ''۔ یعنی : اولاد ابراہیم میں سے داؤد ، سلیمان ، ایوب ،یوسف، موسیٰ اور یارون تھے اور اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزاء دیتے ہیں ، نیز زکریا ، یحییٰ اور عیسیٰ (علیہ السلام)(بھی تھے) جو سب کے سب صالحین میں سے تھے۔"

اس آیت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے شمار کیا گیا ہے حالانکہ وہ بیٹی کی اولاد تھے اور جو شیعہ سنّی روایات امام حسن (علیہ السلام) اور امام حسین

(علیہ السلام) کے بارے میں مذکور ہیں ان میں بارہا " ابن رسول اللہ " (فرزند رسول) کا لفظ ان کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

وہ آیات جن میں ایسی عوتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح حرام ہے ان کے لئے فرمایا گیا ہے: ’’وحلائل ابنائکم ‘‘۔یعنی ... تمہارے بیٹوں کی بیویاں ۔ لہٰذا فقہائے اسلام کے درمیان یہ مسئلہ مسلم ہے کہ بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کی بیویاں انسان پر حرام ہیں اور وہ سب مندرجہ بالا آیت میں داخل ہیں‘‘۔(26)

خلاصہ یہ کہ مذکورہ آیات کے ذیل میں مفسرین قرآن کے استدلال اور اقوال سے واضح ہو جاتا ہے کہ نہ فقط شیعہ مفسرین بلکہ بعض اہل سنت مفسرین اور علماء بھی امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کو رسول اللہ ﷺ کی ذریت اور اولاد سمجھتے ہیں۔یہ بات ایک شرعی اور عرفی حقیقت سمجھی جاتی ہے، کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی اور بعد میں آنے والے تمام ادوار میں مسلمان علماء اور عوام جناب حسنین شریفین علیہما السلام کو آنحضرت ﷺ کا بیٹا ہی قرار دیتے رہے ہیں اور اسی عنوان سے یاد کرتے ہیں ۔آخر میں اس موضوع کی تائید میں دو احادیث بھی نقل کی جاتی ہیں۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ان دونوں نواسوں کے بارے میں فرمایا: ’’ھذان ابنای من احبھما فقد احبنی‘‘ یعنی: ’’حسن و حسین میرے دو بیٹے ہیں جس نے بھی ان سے محبت کی، اُس نے مجھ سے محبت کی ہے‘‘۔(27)

ایک دوسری حدیث میں فرمایا: ’’ان ابنی ھذین ریحانتی من الدنیا ‘‘۔یہ میرے دو بیٹے دنیا میں میرے دو (ریحانہ) پھول ہیں۔(28)

*****

حوالہ جات

1۔ احزاب: ۲۱

2 ۔آل عمران: ۶۱۔

3 ۔انعام: ۸۴تا۸۷۔

4۔بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، فتن باب ۲۰ ،حدیث نمبر ۷۱۰۹ و صلح باب ۹،حدیث نمبر ۲۷۰۴

5۔ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، تفسیر قرآن العظیم، دار طیبہ للنشر والتوزیع، مکہ مکرمہ، ۱۴۲۰ھ، ج۳، ص۲۹۸ سورۂ انعام: ۸۶
6۔ سیوطی، جلال الدین، الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، ج۳، ص۳۱۱
7۔ قرشی، سید علی اکبر، تفسیر احسن الحدیث، ج۳، ص۲۶۴، بنیاد بعثت، تہران ۱۳۷۷ش
8۔ طوسی، محمد بن حسن، التبیان فی تفسیر القرآن، احیا التراث العربی، بیروت، بی تا، ج۴، ص۱۹۴
9۔ طوسی، محمد بن حسن، التبیان فی تفسیر القرآن، ج۸، ص۳۴۶
10۔ شوکانی، محمد بن علی بن محمد، فتح القدیر، دار الوفاء، بیروت، بی تا، ج۲، ص۱۹۴
11۔ مغنیہ، محمد جواد، تفسیر کاشف، دار الانوار، بیروت، الطبعۃ الرابعۃ، ج۲، ص۸۷
12۔ مغنیہ، جواد، التفسیر الکاشف، دار الانوار، بیروت، ج۳، ص۲۱۹
13۔ ایضاً، تفسیر کاشف، ج۳، ص۲۱۹۔
14۔ فخر الدین رازی، محمد، تفسیر کبیر، دار الفکر، بیروت، ۱۴۰۱ھ، ج۸، ص۲۸۴
15۔ ایضاً ج۱۳، ص۵۴
16۔ طبرسی، تفسیر مجمع البیان، ج۴، س۵۱۱
17۔ رواہ احمد والبخاری واصحاب السنن إلا ابن ماجہ عن ابی بکرۃ
18۔ رواہ الطبرانی والحاکم والبیہقی عن عمر
19۔ وہبۃ بن مصطفیٰ الزحیلی التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنہج، ج۳، ص۲۴۹
20۔ وہبۃ بن مصطفیٰ الزحیلی التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنہج، ج۷، ص۲۷۹، دار الفکر المعاصر - بیروت، دمشق، الطبعۃ: الثانیۃ، ۱۴۱۸ھ
21۔ طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، موسسۃ الاعلمی، بیروت، ۱۴۱۷ھ الطبعۃ الاولی، ج۷، ص۲۵۱
22۔ طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، موسسۃ الاعلمی، بیروت، ۱۴۱۷ھ الطبعۃ الاولی، ج۷، ص۲۷۰
23۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن ج۷، ص۲۷۱ تا ۲۷۴
24۔ قرائتی، محسن، تفسیر نور، مرکز فرہنگی درسهای از قرآن، تہران، ج۳، ص۵۲۹
25۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: شیرازی، ناصر مکارم، تفسیر نمونہ، دار الکتب اسلامیہ، تہران، ج۲، ص۳۵۱
26۔ شیرازی، ناصر مکارم، تفسیر نمونہ، دار الکتب اسلامیہ، تہران، ج۲، ص۳۵۵
27۔ ابن عساکر، تاریخ مدینہ، ترجمہ الامام الحسین (علیہ السلام)، ص۵۹، ح۱۰۶، طبع بیروت۔
28۔ ایضاً، ص۶۲، حدیث نمبر ۱۱۲

صلح کی اہمیت اور شرائط

نہج البلاغہ کی روشنی میں ایک مطالعہ

ڈاکٹر روشن علی*
roshanali007@yahoo.com
ڈاکٹر کرم حسین ودھو†

کلیدی کلمات: صلح، وعدہ،، وفائے عہد، ہوشیاری، دوراندیشی، دوست، دشمن، غفلت، مکاری۔

خلاصہ

اسلام کے سیاسی اور اجتماعی نظام میں قابل بحث مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ مخالفین سے صلح و تفاہم اور اس کی شرائط نیز صلح کے مختلف پہلوؤں اور دائرہ کار کا مسئلہ ہے۔ اسلام اگرچہ مخالفین کے مقابل اپنا قطعی سیاسی واعتقادی موقف رکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود اسلام اپنے مخالفین کے ساتھ صلح پسند پڑوسی کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا حکم دیتا ہے۔ ہم اس مقالہ میں حضرت علی علیہ السلام کے کلام نہج البلاغہ کی روشنی میں صلح کی ضرورت، اہمیت اور اس کی شرائط کو واضح کریں گے کہ آیا صلح صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے ہونی چاہیے تاکہ صلح کے ذریعے ملک اور معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جائے۔ جب صلح کی جائے تو اس کی پاسداری کرنا اور وعدہ وفا کرنا بھی لازمی وضروری ہوتا ہے، کیونکہ اس کو توڑنا ایک ایسا گناہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ پر جرائت کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

*۔ اسسٹنٹ پروفیسر اسلام آباد، ماڈل کالج برائے طلبہ، F-10/3، اسلام آباد۔
† ۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر؛ ڈائریکٹر ریجنل ڈائریکٹوریٹ آف کالجز (لاڑکانہ)

مقدمہ

انسانی تاریخ میں جینے اور جینے دینے یا مرنے اور مارنے کے لئے صلح اور جنگ نے انسانوں کو ہمیشہ باہمی آویزشوں سے دوچار کیا ہے، لیکن صلح وآشتی کی زندگی گذارنا، زندگی کو دوام بخشنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ انسان کا مقصد بھی رہا ہے، جس نے انسان کو کم از کم یہ فرصت عطا کی کہ وہ باہمی تلخیوں اور قتل وغارت سے اپنا دامن بچا کر کچھ وقت امن وسکون سے گزار سکے۔ اسی لئے صلح روز اول سے اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اسی طرح تاریخ گواہ ہے کہ اوائل اسلام میں جو جنگیں لڑی گئی تھیں وہ مسلمانوں پر مسلط کی گئیں تھیں۔ چونکہ جب دشمن حملہ کر دے اور نابود کرنے کے درپے ہو تو ایسے حالات میں اسلام اپنے دفاع کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ ایسی ہی جنگیں رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں وقوع پزیر ہوئیں، جنہیں دفاعی جنگوں کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اسی حضرت علی علیہ السلام پر بھی جنگیں مسلط کی گئی تھیں، جن پر امام علیہ السلام کی حکومت کی بہت سی توانائیاں اور وقت صرف ہوا ہے۔ چاہے وہ جنگ جمل ہو یا صفین یا نہروان، ان سب جنگوں میں مسلمانوں کا بہت بڑا قیمتی سرمایہ اور جانیں قربان ہوئی ہیں۔ اسلام تو جنگ میں بھی محدودیت کا قائل ہے۔ اگر جنگ میں دشمن مسلمانوں کا مثلہ کرے تو بھی مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں کہ وہ دشمن کا مثلہ کریں۔ اگر دشمن جنگ میں اسیروں کو بھوکا پیاسا رکھے تو اس کے مقابل لشکرِ اسلام کو اجازت نہیں کہ وہ ایسا کرے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نبی کریم ﷺ سے ایک روایت بیان کرتے ہیں:

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه و آله إِذَا أَرَادَ أَنْ يَبْعَثَ سَرِيَّةً دَعَاهُمْ فَأَجْلَسَهُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ ثُمَّ يَقُولُ سِيرُوا بِسْمِ اللَّهِ وَ بِاللَّهِ وَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ عَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللَّهِ لَا تَغُلُّوا وَ لَا تُمَثِّلُوا وَ لَا تَغْدِرُوا وَ لَا تَقْتُلُوا شَيْخاً فَانِياً وَ لَا صَبِيّاً وَ لَا امْرَأَةً وَ لَا تَقْطَعُوا شَجَراً إِلَّا أَنْ تُضْطَرُّوا إِلَيْهَا۔۔۔الخ-(1)

یعنی: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ جب کسی جنگی مہم پر کسی کو روانہ کرتے تھے تو اس کو اپنے پاس بلاتے تھے اور اپنے سامنے بٹھاتے تھے، پھر اُسے ارشاد فرماتے تھے کہ روانہ ہو جاؤ اللہ کے نام سے، اللہ کی خاطر، فی سبیل اللہ اور رسول اللہ کے دین پر۔ (پھر فرماتے تھے) کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرنا، کسی کا مثلہ نہ کرنا، کسی کے ساتھ غداری اور دھوکہ بازی نہ کرنا، کسی بوڑھے آدمی کو قتل نہ کرنا، نہ بچے کو اور نہ ہی کسی عورت کو قتل کرنا، درختوں کو نہ کاٹنا سوائے ایسی مجبوری کہ ان کو کاٹے بغیر رہا نا جاسکتا ہو۔۔۔"

اسی طرح امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اپنی وصیت میں فرماتے ہیں:
يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا أُلْفِيَنَّكُمْ تَخُوضُونَ دِمَاءَ الْمُسْلِمِينَ خَوْضاً تَقُولُونَ قُتِلَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ أَلَا لَا تَقْتُلُنَّ بِي إِلَّا قَاتِلِي انْظُرُوا إِذَا أَنَا مِتُّ مِنْ ضَرْبَتِهِ هَذِهِ فَاضْرِبُوهُ ضَرْبَةً بِضَرْبَةٍ وَلَا تُمَثِّلُوا بِالرَّجُلِ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صلی اللہ علیہ و آلہ يَقُولُ إِيَّاكُمْ وَالْمُثْلَةَ وَلَوْ بِالْكَلْبِ الْعَقُورِ۔ (2)

یعنی: " اے اولاد عبد المطلب مسلمانوں کا خون بہاتے نہ رہنا یہ کہتے ہوئے کہ امیر المؤمنین کو قتل کیا گیا ہے۔ دیکھو قصاص کے طور پر میرے قاتل کے علاوہ کسی اور کو قتل نہ کرنا۔ دیکھو جب میں اس ضربت سے فوت (شہید) ہو جاؤں تو میرے دشمن کو بھی ایک ضربت کے بدلے میں ایک ہی ضربت لگانا۔ اس کا مثلہ نہ کرنا، کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کسی کا مثلہ نہ کرنا چاہے وہ کاٹنے والا کتا ہی کیوں نہ ہو۔"

اس وصیت سے واضح ہوتا ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑے سے روکتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ علیؑ کے شہید ہو جانے کے بعد ناحق لوگوں کو قتل کیا جائے بلکہ صرف قاتل ہی کو قصاص کے طور پر قتل کیا جائے۔ اور اس میں بھی امامؑ زیادتی سے روکتے ہیں کہ دشمن نے ایک ضربت لگائی ہے تو اس کو بھی ایک ہی ضربت لگائی جائے۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ کی ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مثلہ کرنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ کاٹنے والے کتے کا مثلہ بھی نہ کیا جائے چہ جائیکہ میرے قاتل کا مثلہ کیا جائے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ دشمن جس نے علی علیہ السلام جیسی عظیم ہستی کو ناحق قتل کیا ہے، امام علیہ السلام اس کے ساتھ بھی زیادتی کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

صلح کا مفہوم

یہاں پر موضوع کو بیان کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ صلح کے معانی بیان کئے جائیں۔ صلح عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی اور اصطلاحی معنی کچھ یوں ہیں:

لفظی: عربی لغت المنجد میں صلح کے لغوی معنی اس طرح بیان ہوئے ہیں:

صلُح(ک)، صلَح(ف،ن)، صلوحاًو صلاحیة: درست و ٹھیک ہونا، خرابی کا دور ہونا۔

الصلح: سلامتی، رضامندی، درستی، قوم صلح و صلوح: آپس میں موافقت رکھنے والے لوگ۔ (3)

اسی طرح عربی لغت "فرہنگ بزرگ" جو عربی سے فارسی میں لکھی گئی ہے۔اس کتاب میں صلح کے اس طرح معانی بیان ہوئے ہیں:

نفع و فایدہ، لیاقت و مناسب بودن، حسن و خوبی، استعداد و کفایت، رفع کاستی ہای کہ در کسی وجود داشتہ وآنرا رفع واز خود دور ساختہ خودش رااصلاح واکمال نماید، خوبی، خیر اندیشی وانجام عمل شایستہ، آسایش و نعمت، بسیار بودن و کثرت چیزی، آشتی و سازش، اتحاد و اتفاق، آتش بس و خود داری از جنگ، امنیت (4)

صلح کا مترادف لفظ سِلم ہے جس کے معنی ہیں: السِّلم: صلح کرنے والا، کہتے ہیں: انا سِلم لمن سالمنی و حرب لمن حاربنی۔ میں صلح کرنے والے کے لیے صلح جو ہوں اور جنگ کرنے والے کے لیے جنگ جو ہوں۔سِلم و سَلم صلح کن قوم، سلامتی اسلام۔(5)

اصطلاحی معنی

الصلحُ: ھو رَفعُ الحربِ و المُخاصَمَات علی شروطٍ تُعرَفُ بشروطِ الصلحِ. او ھو عقد یرفع النزاعَ یعنی: "صلح اصطلاح میں جنگ اور دیگر اختلافات و منازعات کو رفع کرنا، ایسی شرائط پر جن کو صلح کی شرائط سے متعارف کرایا یا یاد کیا جائے۔ یا صلح ایک ایسا عقد و پیمان ہے جس سے جنگ و جدال اور اختلافات کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔" یہ تعریف جنگ کے ساتھ تمام اختلافات میں صلح کو شامل ہے چاہے وہ اختلافات مالی و اقتصادی ہوں، سیاسی و سماجی ہوں، خاندانی و لسانی ہوں یا فقہی وغیرہ۔

نتیجہ یہ کہ صلح کے معانی درست و ٹھیک ہونا۔ خرابی کا دور ہونا، سلامتی ، رضامندی، درستی، آپس میں موافقت، اتحاد واتفاق، نفع و فائدہ، حسن و خوبی، جنگ سے ہاتھ اٹھالینا، کسی چیز کا کثرت سے ہونا، امن و آشتی، صلح جو ہونا وغیرہ ہے۔اسی طرح جنگ اور دیگر اختلافات چاہی وہ فقہی ہوں، سیاسی ہوں، سماجی ہوں، اقتصادی وغیرہ ہوں، اس کے متعلق شرائط کے ساتھ ان کا خاتمہ کیاجائے تاکہ معاشرہ میں امن و سکون ہوجائے۔ صلح کی ضد فساد ہے پس یہاں پر ضروری ہے کہ فساد کے معانی بھی بیان کئے جائے تاکہ صلح مزید واضح ہوجائے کیونکہ ایک مقولہ ہے کہ چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں:

فساد کے لفظی معانی:

فساد کے لغوی معانی اس طرح بیان ہوئے ہیں: الفساد نقیض الصلاح۔تفاسد القوم تدابروا و قطعوا الا رحاما لحدب فی البر والقحط فی البحر ای فی المدن التی علی الانھار۔(6) یعنی: "فساد اصلاح (امن) کی ضد ہے۔ قوم کا فساد کرنا یعنی قوم کا ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدال (قتل و غارت گری) تخریبی تدابیر کرنا فساد کہلاتا ہے۔ گویا یہ فساد ایسا ہے جیسا کہ خشکی میں پانی کا فقدان، نہری زمینوں میں پیداوار کی قلّت (یعنی جن کی پیداوار کا دارومدار نہری پانی پر ہو کیونکہ پانی کا خشک ہونا قحط سالی کا باعث ہے) یہی فساد ہے۔" فساد کی ایک اور تعریف یوں بیان کی گئی ہے: الفساد اللھو و اللعب / اخذ المال ظلما(7) یعنی: "فساد لہو و لعب کو کہتے ہیں /زبردستی کسی کا مال چھین لینا بھی فساد ہے۔" فساد کی تعریف میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ: فساد الرجل: جاوز الصواب و الحکمة/الامور اضطرابت و ادرکھا الخلل(8) یعنی: "کسی شخص کا صحیح اور حق بات سے روگردانی کرنا فساد ہے۔کام کا بگڑ جانا اور اس میں خلل اندوزی فساد ہے۔/ کسی کام میں ایسی خلل اندوزی اور بگاڑ جس سے کام سدھرنے کے بجائے بگڑ جاتے ہوں۔ کسی کام میں بگاڑ اور اضطراب فساد کہلاتا ہے۔"(9)

فساد کی اصطلاحی تعریف

فساد کی اصطلاحی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے: الفساد: خروج الشی عن الاعتدال قلیلا کان الخروج عنه او کثیر او یضاد الصلاح و یستمل ذالک فی النفس و البدن والاشیا الخارجة عن الاستقامة یقال فسد و فسادا و فسودا و افسدہ غیرہ(10) یعنی: "فساد کے معنی کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز کر جانے کے ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ تجاوز کم ہو یا زیادہ یہ اصل میں اصلاح کی ضد ہے اور نفس، بدن اور ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو حالت استقامت سے نکل چکی ہو اور افسدہ کے معنی کسی چیز کا توازن بگاڑنے کے ہیں۔"(11)

فاذا اطلق الصلاح تناول جمیع الخیر و کذالک الفساد یتناول جمیع الشر ۔۔۔ و کذالک اسم المصلح و المفسد-(12) یعنی: "صلاح کا لفظ جب مطلق استعمال ہوتا ہے تو تمام خیر کو شامل ہوتا ہے اور فساد کا لفظ تمام برائیوں کو۔۔۔اسی طرح مصلح اور مفسد میں تمام معانی پائے جاتے ہیں۔"(13)

نتیجہ یہ کہ ہر اصلاح کی ضد کو فساد کہا جاتا ہے جیسا کہ قوم کا ایک دوسرے کے ساتھ جنگ و جدال کرنا، قتل و غارتگری، تخریب کاری، قطع رحمی، لہو و لعب، زبردستی یا غیر قانونی طور پر مال کا حاصل کرنا، کسی شخص کا حق بات ماننے سے انکار کرنا یا انسانی امور میں بگاڑ پیدا کرنا یا کسی کام کو بجائے سدھارنے کے بگاڑنا۔ گویا ہر اصلاح کے برعکس جو عمل ہے وہ فساد ہے چاہے یہ انفرادی ہو یا اجتماعی، کسی فرد کا ہو یا کسی قوم کا، فساد کہلاتا ہے۔(14)

صلح کرانے کی خاطر جھوٹ بولنا

حضرت ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتی ہیں: لَیسَ الْکَذَّابُ الَّذِیْ یَصْلُحُ بَیْنَ النَّاسِ فَیَنْمِیْ خَیْراً اَوْ یَقُوْلُ خَیْراً۔(15) یعنی: "جھوٹا وہ نہیں ہے جو لوگوں میں باہم صلح کرانے کی کوشش کرے اور اس کے لیے کسی اچھی بات کی چغلی کھائے یا اسی سلسلہ کی اور کوئی اچھی بات کہہ دے۔" اسی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت مروی ہے: اَلْمُصْلِحُ لَیْسَ بِکَاذِبٍ۔ (16) یعنی: "صلح کرانے والا جھوٹا نہیں ہے (اگر وہ صلح کرانے کے لیے کوئی جھوٹ بولے)۔"

صلح کی خاطر جنگ شروع کرنے میں تاخیر کرنا

میدان صفین میں حضرت علی علیہ السلام نے جب اذن جہاد دینے میں تاخیر کی تو آپؑ کے اصحاب نے بے چینی کا اظہار کیا کہ شاید امیر المومنینؑ شامیوں سے جنگ کرنے میں شک و شبہ کا شکار ہیں، تو آپ علیہ السلام نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا: أَوَ أَمَّا قَوْلُکُمْ شَکّاً فِی أَهْلِ الشَّامِ فَوَاللَّهِ مَا دَفَعْتُ الْحَرْبَ یَوْماً إِلَّا وَ أَنَا أَطْمَعُ أَنْ تَلْحَقَ بِی طَائِفَةٌ تَهْتَدِیَ بِی وَ تَعْشُوَ إِلَی ضَوْئِی وَ ذَلِکَ أَحَبُّ إِلَیَّ مِنْ أَنْ أَقْتُلَهَا عَلَی ضَلَالِهَا وَ إِنْ کَانَتْ تَبُوءُ بِآثَامِهَا۔ (17)

یعنی: ''اس طرح تم لوگوں کا یہ کہنا کہ مجھے اہلِ شام سے جہاد کرنے کے جواز میں کچھ شُبہ ہے تو خدا کی قسم! میں نے جنگ کو ایک دن کے لئے بھی التوا میں نہیں ڈالا، مگر اس خیال سے کہ ان میں سے شاید کوئی گروہ مجھ سے آکر مل جائے، اور میری وجہ سے ہدایت پا جائے اور اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے میری روشنی کو بھی دیکھ لے اور مجھے یہ چیز گمراہی کی حالت میں انہیں قتل کر دینے سے کہیں زیادہ پسند ہے۔ اگرچہ اپنے گناہوں کے ذمہ دار بہر حال یہ خود ہوں گے۔''

امیر المومنین علیہ السلام کے اس فرمان سے واضح ہوتا ہے کہ صلح اور ہدایت کی خاطر جنگ کو کچھ دیر کے لیے موخر کیا جائے تاکہ ہدایت پانے والے راہ راست پر آکر ہدایت پاجائیں اور حق ان کے سامنے آجائے۔

صلح کی ضرورت واہمیت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے اور اپنا نائب بنایا۔ اس کے ساتھ اس کی آزمائش کے لیے ایک عیار اور مکار دشمن شیطان کی صورت میں بھی بنایا، جو ہر وقت اس کو بہکاتا رہتا ہے اور آپس میں اختلافات اور لڑائی و جھگڑا کرواتا رہتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کی وضاحت یوں بیان ہوئی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ۔ (18)

یعنی: " اے ایمان والو! تم سب کے سب (دائرہ) امن وآشتی میں آجاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

پس اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ صلح و صفائی سے رہنے کا حکم دیا ہے اور آپس میں اختلاف سے روکا ہے اور اس کے ساتھ ایک عیار دشمن سے باخبر بھی کیا ہے کہ اس کی بات نہ مانیں کیونکہ وہ تمہارا دشمن ہے، جو تمہارے اپنے اندر دشمنیاں پیدا کراتا ہے۔ پس ان تمام اختلافات کو ختم کرنے کے لیے اور اپنے معاشرہ کو امن کا گہوارا بنانے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ صلح و صفائی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کبھی یہ اختلاف دو افراد کے درمیان ہوتے ہیں اور کبھی دو خاندانوں میں ہوتے ہیں اسی طرح دو گروہوں میں اختلاف ہو سکتے ہیں جن میں صلح کرانے کے لیے معاشرہ کے دیگر افراد کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ قرآن کریم میں اس کی وضاحت یوں بیان ہوئی ہے:

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ۔ (19)

یعنی: " اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ جب بھی مومنین کا آپس میں اختلاف ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرائی جائے، اگر کوئی فریق صلح کے لیے تیار نہیں ہو رہا ہو تو اس صورت میں اس کو صلح کے لئے آمادہ کیا جائے اور اس کے ساتھ سختی کی جائے تاکہ وہ صلح کر لے۔ پس جب صلح کی جائے تو ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے۔ پس ہر حال میں صلح و صفائی کے ساتھ زندگی بصر کی جائے اور متعلق امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام اپنی وصیت میں ارشاد فرماتے ہیں:

لوگوں کے درمیان صلح کرایا جائے جس کے نتیجے میں چھوٹے موٹے اختلافات ختم ہو جائیں۔ اس کے متعلق امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام اپنی وصیت میں ارشاد فرماتے ہیں: وَ صَلَاحِ ذَاتِ بَيْنِكُمْ فَإِنِّي سَمِعْتُ جَدَّكُمَا صلى الله عليه و آله يَقُولُ صَلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ أَفْضَلُ مِنْ عَامَّةِ الصَّلَاةِ وَ الصِّيَامِ۔ (20) یعنی: "آپس میں صلح کیا کرو کیونکہ میں نے تمہارے نانا ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپس میں صلح و صفائی سے رہنا عام نماز اور روزے سے افضل ہے۔"

اسی طرح ایک حدیث میں ارشاد ہے: إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ أَفْضَلُ مِنْ عَامَّةِ الصَّلَاةِ وَ الصَّوْمِ۔ (21) یعنی: "دو گروہوں میں صلح کرانا عام نماز و روزوں سے افضل ہے۔"

اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے: عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم: ''أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَ الصَّدَقَةِ وَ الصَّلَاةِ قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ صَلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ وَ فَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ وَ هِيَ الْحَالِقَة''۔ (22) یعنی: "حضرت ابو درداؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں روزے، نماز، اور صدقے سے بڑھ کر افضل درجات کے اعمال نہ بتاوں؟ انہوں نے کہا: ہاں یا رسول اللہ، تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ آپس میں میل جول کرا دینا ہے۔ اس لیے کہ آپس کی پھوٹ دین کو تباہ کر دینے والی خصلت ہے۔"

ان دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف ہلاکت و تباہی و بربادی کا سبب بن جاتا ہے لیکن صلح و صفائی امن و امان قائم ہوتا ہے اور معاشرہ پر سکون ہو جاتا ہے اسی لیے صلح کرانے کا درجہ اور فضیلت نماز و روزوں سے افضل ہے۔

پس ایک کامیاب سیاست دان اور سپہ سالار وہ نہیں جو صرف میدانِ جنگ میں دشمن کو شکست فاش سے دو چار کردے، بلکہ در حقیقت اصل کام یاب سیاست دان اور سپہ سالار وہ ہے جو میدان مکالمہ میں ایسی شرائط منوا کر اور مان کر صلح کرے، جس کے بعد کامیابیوں اور فتوحات کے راستے ہموار ہو جائیں اور پورا معاشرہ امن و سکون کا گہوارا بن جائے اسی طرح تھوڑے ہی عرصے میں اس صلح کے ثمرات ملک، قوم اور ملت بلکہ آنے والی نسلوں تک پہنچیں کیونکہ بسا اوقات میدان جنگ میں فتح پانے والے میدان مکالمہ میں ایسی مات کھا جاتے ہیں کہ صدیوں تک ان کی فوج اور قوم سنبھالے نہیں سنبھل سکتی۔ پستی، ذلت، رسوائی اور شکست اس قوم کا مقدر بن جاتی ہے اور میدان جنگ میں فتح ان کے لیے کوئی قابلِ فخر بات نہیں رہتی۔ اس لیے جس بیدار مغزی، دور اندیشی اور چستی کی ضرورت میدان جنگ میں ہوتی ہے اس سے کہیں بڑھ کر میدان مکالمہ میں بیدار مغزی، دور اندیشی اور چستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دشمنوں اور دوستوں کے ساتھ کئی معاہدہ کئے اور تمام کے تمام کامیاب ہوئے کیونکہ آپ ﷺ جتنے بھی معاہدہ کئے وہ سب صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے تھے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو کامیاب بنادیا۔

اسی طرح حضرت علی علیہ السلام بھی ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ کے علم کے وارث اور باب مدینہ علم ہونے کی حیثیت سے کامیاب صلح کی اہمیت اور شرائط کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جس میں کامیابی کے زیادہ سے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے گورنر مالک اشتر کو لکھے ہوئے عہد نامے میں دشمن کے ساتھ صلح اور اس کی شرائط، طریقہ کار اور معاہدوں کی اہمیت اور ان کے اخلاقی پہلوؤں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: وَ لَا تَدْفَعَنَّ صُلْحاً دَعَاكَ إِلَيْهِ عَدُوُّكَ۔ (23) یعنی: ''صلح کی دعوت کو کسی بھی صورت میں نہ ٹھکرانا اگر دشمن تمہیں صلح کی دعوت دے۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جب بھی دشمن صلح پر آمادہ ہو تو اس کے ساتھ صلح کی جائے کیونکہ جنگ کسی بھی صورت مسئلے کا حل نہیں ہوتی بالاخر صلح کی میز پر جمع ہونا ہوتا ہے اور اسلام بنیادی طور پر جنگ کا خواہاں ہے ہی نہیں، وہ امن اور سلامتی چاہتا ہے، لہٰذا جب بھی دشمن صلح کی دعوت دے تو اس کی دعوت کو قبول کیا جائے اور اس کے ساتھ صلح کیا جائے۔ اسی طرح قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صلح کی دعوت کو قبول کرنے کا حکم دیتے

ہوئے ارشاد فرمایا ہے: وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۔ (24) یعنی: "اور (اے رسول) اگر وہ صلح و آشتی کی طرف مائل ہو جائیں تو آپ بھی مائل جایئے اور اللہ پر بھروسہ کیجیے یقینا وہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔"

صلح کی شرائط

پس دشمن کی صلح کی دعوت کو قبول کیا جائے اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جائے اور دشمن سے بے خوف و خطر ہو کر غافل نہ ہو جائے بلکہ دشمن سے باخبر رہے۔ پس دشمن کے ساتھ صلح بھی ایسی ہو کہ جس میں خداوند متعال کی خوشنودی شامل حال ہو۔ اس کے متعلق امام علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

و لِلّٰہِ فِیہِ رِضًا ۔(25) یعنی: "صلح ایسی ہو کہ جس میں اللہ کی رضا ہو۔"

اسی طرح قرآن کریم میں بھی ارشاد رب العزت ہے: "لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا۔" (26) ترجمہ: "ان لوگوں کی بیشتر سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے مگر یہ کہ کوئی صدقہ، نیکی یا لوگوں میں اصلاح کی تلقین کرے اور جو شخص اللہ کی خوشنودی کے لیے ایسا کرے تو اسے عنقریب ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔"

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ صدقہ، نیکی اور صلح ایسا ہو کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو تو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر عظیم عطا ہوتا ہے۔ اگر اسی میں اللہ کی رضا اور خوشنودی نہ ہو تو اس میں کسی قسم بھلائی اور خیر نہیں ہوتا۔ پس صلح ایسی ہو کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہو۔

اسی طرح سورہ النسا میں ایک اور مقام پر ارشاد ہے: وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا۔ (27) ترجمہ "صلح تو بہر حال بہتر ہی ہے اور ہر نفس کو بخل کے قریب کر دیا گیا ہے لیکن تم نیکی کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہارے سارے اعمال سے یقینا خوب باخبر ہے۔"

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ صلح ہر حال میں بہتر ہے، کیونکہ اس میں امن و سلامتی ہوتی ہے، فتنہ و فساد سے معاشرہ محفوظ رہتا ہے۔ اس آیت میں صلح کی شرائط میں سے ایک اہم شرط کا ذکر ہوا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہونی چاہیے، ایسا نہ ہو کہ اللہ کو ناراض کرکے دشمن کے ساتھ صلح کر لیں۔ پس اگر صلح ایسی ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا شامل ہو تو اس کے بہت سے فوائد ہیں۔

صلح کے فوائد

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام صلح کے فائدے بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

فَإِنَّ فِي الصُّلْحِ دَعَةً لِجُنُودِكَ وَرَاحَةً مِنْ هُمُومِكَ وَأَمْناً لِبِلَادِكَ۔(28)

یعنی : " صلح میں تمہارے لشکر کے لیے آرام و راحت ہے اور خود تمہارے لیے فکروں سے نجات اور شہروں کے لیے امن اور امان کا سامان ہے۔"

اس میں صلح کے چار فوائد بیان ہوئے ہیں:

1. لشکر کا آرام و راحت
2. حاکم و سردار کے لیے فکر سے نجات
3. شہروں کا امن و امان

اس سے واضح ہوتا ہے کہ صلح میں آرام و راحت ملتی ہے کیونکہ جنگ کی صورت میں دونوں اطراف میں کشیدگی اور اور لڑائی و جھگڑا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے لشکر کو سکون و راحت نہیں ہوتا اور نہ ہی حکومت کو اس کے ساتھ پوری ملت بھی پریشانی میں مبتلا ہوتی ہے۔ ہر طرف بے اطمینانی اور بے چینی ہوتی ہے لہٰذا جب صلح ہوگی تو اس کی وجہ سے لشکر کو آرام و راحت ملے گا اور حکومت بھی اطمینان و سکون میں ہوگی۔ اسی طرح ملکی حدود میں بھی امن و امان قائم ہوگا اور عوام کو بھی آرام و راحت میسر ہوگا۔ جس کی وجہ ملک و ملت ترقی کی راہ پر گامزن ہوں گے، ملک میں خوشحالی آئے گی، راستے پُر امن ہو جائیں گے۔

صلح کے بعد چوکس ہونا

ایسا بھی نہ ہو کہ دشمن سے صلح کرنے کے بعد بے خوف و خطر ہو کر بیٹھ جائیں کیونکہ صلح کے بعد دشمن کے حملوں کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: وَلَكِنِ الْحَذَرَ كُلَّ الْحَذَرِ مِنْ عَدُوِّكَ بَعْدَ صُلْحِهِ فَإِنَّ الْعَدُوَّ رُبَّمَا قَارَبَ لِيَتَغَفَّلَ فَخُذْ بِالْحَزْمِ وَاتَّهِمْ فِي ذَلِكَ حُسْنَ الظَّنِّ۔(29) یعنی : " لیکن صلح کے بعد دشمن سے خوب چوکس، خوب ہوشیار رہنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے، صلح کی راہ سے اس نے تقرّب اس لیے حاصل کیا ہو کہ بے خبری میں تم پر ٹوٹ پڑے لہٰذا بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے اس معاملے میں حسن ظنّ سے کام نہیں چل سکتا۔"

پس جب دشمن سے صلح ہو جائے تو اس کے بعد اس سے پہلے سے زیادہ ہوشیار و چوکس رہنا چاہیے کیونکہ بعض اوقات دشمن صلح کرتا ہی اسی لیے ہے کہ وہ اس سے اپنے حریف کو غافل بنا کر مکاری اور فریب کاری سے حملہ کر دے، جس کے نتیجے میں بہت بڑا ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے، لہٰذا جب دشمن سے صلح ہو جائے تو حسن ظن سے کام لیے ہوئے بے خبر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ دشمن کی ہر چال پر کڑی نظر ہونی چاہیے، تاکہ آنے والے خطرات سے اپنی قوم و ملک کو محفوظ بنایا جاسکے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے نبی کریم ﷺ کو دشمن کی طرف سے دھوکہ دہی سے ہوشیار کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ۔ (30)

یعنی: "اور اگر وہ آپ کو دھوکہ دینا چاہیں تو آپ کے لیے یقینا اللہ کافی ہے، وہی تو ہے جس نے اپنی نصرت اور مومنین کے ذریعے آپ کو قوت بخشی ہے۔"

اس آیت میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر دشمن سے صلح کی جائے اور وہ صلح کرنے کے بعد اس کو توڑ دے تو گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جائے کیونکہ صلح بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور مرضی کے لیے کی گئی تھی۔ لہٰذا اب مدد بھی وہی کرے گا پس اسی ذات پر بھروسہ کیا جائے اور وہی مدد و نصرت کرنے والا ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر بھی ارشاد گرامی ہے: وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔ (31)

ترجمہ: "اور اگر یہ لوگ آپ سے خیانت کرنا چاہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں پس اس نے انہیں آپ کے قابو میں کر دیا اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔"

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ وعدہ خلاف کفار کا شیوہ ہے کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی کہ ایمان لانے کی بجائے کفر پر ڈٹے رہے اور اہل ایمان کو اذیتیں دیتے رہے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ گئے وعدہ اور صلح کی مخالفت کریں اور وعدہ خلافی کریں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پس ان کے ساتھ اگر معاہدہ اور صلح کیا جائے تو ان کی حرکتوں سے یکسر غافل نہیں ہونا چاہیے بلکہ دشمن کی تمام حرکات و سکنات پر نظر رکھنی چاہیے۔

صلح کی پاسداری کرنا

صلح کرنے کے بعد اس کی پاسداری کرنا اسلامی حکومت کا اخلاقی فریضہ ہے۔اس کے متعلق حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

وَ إِنْ عَقَدْتَ بَيْنَكَ وَ بَيْنَ عَدُوِّكَ عُقْدَةً أَوْ أَلْبَسْتَهُ مِنْكَ ذِمَّةً فَحُطْ عَهْدَكَ بِالْوَفَاءِ وَ ارْعَ ذِمَّتَكَ بِالْأَمَانَةِ۔(32) یعنی :" اگر آپ کے اور آپ کے دشمن کے درمیان کوئی معاہدہ طے پا یا ہو یا اسے اپنے دامن میں پناہ دی ہو تو پھر عہد کی پابندی کرو اور وعدہ کا لحاظ رکھو۔"

اس قول میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب صلح ہو جائے تو اس کی تمام شرائط کی پاسداری کرنا فرض بن جاتا ہے کیونکہ اگر ان شرائط کی پاسداری نہ کی گئی تو یہ وعدہ خلافی ہو جاتی ہے اور اسلام نے وعدہ خلافی کرنے کو بے دینی سے تشبیہ دی ہے۔اس کے متعلق ایک حدیث میں ارشاد ہے:

عَنْ عَلِيٍّ ع قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ص لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَ لَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ۔(33)

یعنی: "حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جو امانت کا خیال نہ رکھے۔اور اس کا کوئی دین نہیں جو وعدہ وفا نہ کرے۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو شخص وعدہ وفا نہیں کرتا وہ بے دین ہے، جو بے دین ہو اس کا کوئی اعتبار اور اعتماد نہیں ہوتا۔اسی لیے اسلام اپنے پیروکاروں کو وعدہ وفائی کا حکم دیتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسی خوبی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خوبی کے طور پر متعارف کرایا ہے۔اس کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے: إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ۔(34) ترجمہ: "بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کو حق کہا ہے: فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ۔(35) ترجمہ: "پس صبر کر بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے۔"

ان دونوں آیات کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا ، لہٰذا صاحبان کا فرض بنتا ہے کہ وہ جو بھی عہد اور قول و قرار کریں تو اس کو پورا کریں اور وعدہ خلافی نہ کریں۔اسی طرح حضرت علی علیہ السلام صلح کی پاسداری کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: وَ اجْعَلْ نَفْسَكَ جُنَّةً دُونَ مَا أَعْطَيْتَ فَإِنَّهُ لَيْسَ مِنْ فَرَائِضِ اللَّهِ شَيْءٌ النَّاسُ

أَشَدُّ عَلَيْهِ اجْتِمَاعاً مَعَ تَفَرُّقِ أَهْوَائِهِمْ وَ تَشَتُّتِ آرَائِهِمْ مِنْ تَعْظِيمِ الْوَفَاءِ بِالْعُهُودِ وَ قَدْ لَزِمَ ذَلِكَ الْمُشْرِكُونَ فِيمَا بَيْنَهُمْ دُونَ الْمُسْلِمِينَ لِمَا اسْتَوْبَلُوا مِنْ عَوَاقِبِ الْغَدْرِ فَلَا تَغْدِرَنَّ بِذِمَّتِكَ وَ لَا تَخِيسَنَّ بِعَهْدِكَ۔ (36)

یعنی: " اور اپنے قول واقرار کی حفاظت کے لیے اپنی جان کو سپر بنادو، کیونکہ اللہ کے فرائض میں سے وعدہ کی وفا جیسی کوئی اور چیز نہیں کہ جس کی اہمیت پر دنیا اپنے الگ الگ نظریوں اور مختلف رایوں کے باوجود یکجہتی سے متفق ہو۔ مسلمانوں کے علاوہ مشرکوں نے بھی اپنے درمیان معاہدوں کی پابندی کی ہے۔ اس لیے کہ عہد شکنی کے نتیجہ میں انہوں نے تباہیوں کا اندازہ کیا تھا۔ لہٰذا اپنے پیمان میں غداری نہ کرنا اور نہ ہی اپنے عہد میں بد عہدی کرنا۔"

اس سے عہد ومیثاق کی پابندی کی اہمیت واضح ہوتی ہے، اس طرح کہ اس کو اپنی جان تک دینی پڑے تو دی جائے لیکن وعدہ کی خلاف ورزی نہ کی جائے کیونکہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے وعدہ وفائی کو اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا فریضہ سمجھا ہے، جس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے قومیں تباہ ہوئی ہیں، لہٰذا صلح کرنے کے بعد اس کی پاسداری کرنا انسان پر فرض ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے: أَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذا عاهَدْتُمْ وَ لا تَنْقُضُوا الْأَيْمانَ بَعْدَ تَوْكِيدِها وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ ما تَفْعَلُونَ۔ (37) ترجمہ: "اور جب تم عہد کرو تو اللہ سے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو کہ تم اللہ کو اپنا ضامن بنا چکے ہو، جو کچھ تم کرتے ہو یقینا اللہ اسے جانتا ہے۔"

صلح کے بعد دشمن پر حملہ کرنا بڑا جرم ہے

پس اسلام اس بات کی کبھی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اپنے دشمن کے ساتھ صلح کرنے کے بعد اس کو توڑا جائے بلکہ ہر حال میں اس کی پاسداری کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن پر اچانک حملہ کیا جائے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ پر جرائت کے مترادف ہے اور یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ حضرت علی علیہ السلام دشمن پر اسی طرح اچانک حملہ کرنے سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: وَ لَا تَخْتِلَنَّ عَدُوَّكَ فَإِنَّهُ لَا يَجْتَرِئُ عَلَى اللَّهِ إِلَّا جَاهِلٌ شَقِيٌّ۔ (38) یعنی: "اپنے دشمن پر اچانک حملہ نہ کرنا، کیونکہ اللہ پر جرأت جاہل بدبخت کے علاوہ دوسرا نہیں کرسکتا۔"

صلح کی پاسداری رحمت ہے

حضرت علی علیہ السلام صلح کی پاسداری کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سمجھتے ہیں: وَ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ عَهْدَهُ وَ ذِمَّتَهُ أَمْناً أَفْضَاهُ بَيْنَ الْعِبَادِ بِرَحْمَتِهِ وَ حَرِيماً يَسْكُنُونَ إِلَى مَنَعَتِهِ وَ يَسْتَفِيضُونَ إِلَى جِوَارِهِ۔ (39) یعنی: "اللہ نے عہد و پیمان کی پابندی کو امن کا پیغام قرار دیا ہے کہ جسے اپنی رحمت سے بندوں میں عام کر دیا ہے اور ایسی پناہ گاہ بنایا ہے کہ جس کے دامن میں پناہ لیتے اور اور اس کے جوار میں منزل کرنے کے لیے وہ تیزی سے بڑھتے ہیں۔"

صلح میں دھوکہ بازی نہ ہو

صلح ایسی صاف و شفاف ہو کہ اس میں دھوکہ بازی اور جعلسازی کا شبہ بھی نہ ہو اور نہ ہی اس میں مشتبہ الفاظ لکھے ہوئے ہوں۔ اس بات کا حکم دیتے ہوئے مالک اشتر کو حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: فَلَا إِدْغَالَ وَ لَا مُدَالَسَةَ وَ لَا خِدَاعَ فِيهِ وَ لَا تَعْقِدْ عَقْداً تُجَوِّزُ فِيهِ الْعِلَلَ وَ لَا تُعَوِّلَنَّ عَلَى لَحْنِ قَوْلٍ بَعْدَ التَّأْكِيدِ وَ التَّوْثِقَةِ۔ (40) پس اس میں کوئی جعلسازی، فریب کاری اور مکاری نہ ہونا چاہیے، اور ایسا کوئی معاہدہ کرو ہی نہیں جس میں تاویلوں کی ضرورت پڑنے کا امکان ہو، اور معاہدہ کے پختہ اور طے ہو جانے کے بعد اس کے کسی مبہم لفظ کے دوسرے معنی نکال کر فائدہ اٹھانے کو شش نہ کرو۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جب معاہدہ کیا جائے تو اس کے الفاظ بالکل واضح ہونے چاہییں، اس طرح کہ اس میں کسی قسم کی تاویل کی کوئی گنجائش بھی نہ ہو۔ اس کے بعد کسی طرح بھی اس کو توڑنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ یہ دھوکہ دہی اور جعلسازی ہے، جو اسلام میں انتہائی ناپسند ہے۔ پس جب معاہدہ کیا جائے تو اس کو ہر حال میں پورا کیا جائے چاہے کتنا ہی دشواری کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے تب بھی معاہدہ کو توڑنا نہیں چاہیے۔ اسی بات کا حکم دیتے ہوئے امیر المومنین علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: وَ لَا يَدْعُوَنَّكَ ضِيقُ أَمْرٍ لَزِمَكَ فِيهِ عَهْدُ اللَّهِ إِلَى طَلَبِ انْفِسَاخِهِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (41) یعنی: "اس عہد و پیمان خداوندی میں کسی دشواری کا محسوس ہونا تمہارے لیے اس کا باعث نہ ہونا چاہیے کہ تم اسے ناحق منسوخ کرنے کی کوشش کرو۔"

کیونکہ: فَإِنَّ صَبْرَكَ عَلَى ضِيقِ أَمْرٍ تَرْجُو انْفِرَاجَهُ وَ فَضْلَ عَاقِبَتِهِ خَيْرٌ مِنْ غَدْرٍ تَخَافُ تَبِعَتَهُ وَ أَنْ تُحِيطَ بِكَ مِنَ اللَّهِ فِيهِ طِلْبَةٌ لَا تَسْتَقْبِلُ فِيهَا دُنْيَاكَ وَ لَا آخِرَتَكَ۔ (42) یعنی: "کسی ایسی دشواری کو جھیل جانا کہ جس سے چھٹکارے

کی اور انجام بخیر ہونے کی امید ہو، اس بد عہدی کرنے سے بہتر ہے، جس کے برے انجام کا تمہیں خوف ہو کہ اللہ کے ہاں تم سے اس پر کوئی جوابدہی ہو گی اور اس طرح تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کی تباہی ہو گی۔"

دشمن کو برا بھلا نہ کہنا

حضرت علی علیہ السلام اپنے فوج کو منع کرتے ہیں کہ وہ دشمن کو برا بھلا نہ کہیں :اِنّي اکرہُ لکم ان تَکونوا سبّابینَ وَلکنّکمْ لو وَصَفْتمْ اَعمالَهمْ وَ ذَکرْتُم حالَهُم کانَ اصْوبَ فی القَولِ و اَبْلَغَ فی العُذْرِ۔(43) یعنی: "میں اسے پسند نہیں کرتا کہ تم گالیاں دینے والے اور برا بھلا کہنے والے بن جاؤ۔ اگر تم ان کے اعمال و کردار پر اعتراض کرتے اور انہیں ان کے بداعمالیوں کی طرف متوجہ کرتے تو بھلائی اور ثواب سے زیادہ نزدیک ہوتے اور تمہارا اعتراض بھی بجا ہوتا۔"

دنیا میں ایسا کون سا حاکم ہے جو اپنے دشمن کی بھی ہدایت کا خواہاں ہو۔ یہ صرف آل محمد علیہم السلام کا ہی گھرانا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے ان فوجیوں کو جو دشمن کی فوج کو گالیاں دے رہے تھے ان کو فرمایا کہ اگر وہ اس فوج کے افراد کو ان کے برے اعمال و کردار پر اعتراض کرتے اور ان کی ہدایت کرے تو بہتر ہوتا اور اجر عظیم کے بھی مستحق قرار پاتے۔ لہٰذا حضرت علی علیہ السلام انہیں اس فعل سے منع کرتے ہیں یہاں تک کہ اپنی اور اپنے دشمن کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کا حکم بھی دیتے ہیں:

صلح کے لیے دعا مانگنا

اپنی فوج کو صلح کے لیے دعا مانگنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: و قلْتمْ مَکانَ سبّکم ایّاہُمْ : اللّٰهمّ احْقِنْ دمائَنا و دِمائَهم وَاصْلِحْ ذَاتَ بینَنا و بینَهُمْ واہْدِهِمْ مِنْ ضَلالَتِهِم حتّٰی یَعرِفَ الحقَّ مَنْ جَهِلهٗ ویرعَوِیَ عَنِ الغیِّ والعُدْوانِ مَنْ لَهجَ بِهِ۔(44)

یعنی: " تم لوگ بجائے انہیں گالیاں دینے کے یہ کہتے: خداوندا ! ہماری اور ان کی جانون کی حفاظت فرما۔ ہمارے اور ان کے درمیان صلح و صفا برقرار کر۔ انہیں گمراہی سے نکال کر ہدایت کی راہ پر گامزن کردے تاکہ جو حق کو نہیں پہچانتے پہچان لیں اور عداوت و گمراہی سے باز آجائیں۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے ساتھ ساتھ اپنے دشمن کی جان کی حفاظت بھی دعا کرتا رہے کیونکہ وہ بھی توایک انسان ہے۔ اسی طرح اس کی ہدایت کے لیے بھی دعا کرتا رہے تاکہ معاشرہ سے جو اس کی گمراہی کی وجہ سے فتنہ و فساد تھا اس کا خاتمہ ہو جائے۔

*****

حوالہ جات

1۔ کلینی، محمد بن یعقوب (التوفی: 329ق) الکافی، دار الکتب الإسلامیۃ تہران، طبع: 1407ق، ج ۵، ص ۲۸

2۔ نہج البلاغہ، مکتوبات: وصیت ۴۷

3۔ لویس معلوف الیسوعی، المنجد مادہ صلح

4 ۔ فرہنگ بزرگ جامع نوین عربی سے فارسی

5۔ لویس معلوف الیسوعی، المنجد مادہ سلم

6۔ ابن منظور، محمد ابن مکرم علی ابن احمد الانصاری، لسان العرب، دار الاحیا لتراث العربی للطباعۃ والنشر واللتوزیع بیروت لبان ۱۹۸۸م ج ۱۰، ص ۲۶۱ہ، مادہ فسد، (طبعۃ جدیدۃ محققہ الطبعۃ الاولیٰ)

7۔ لویس معلوف الیسوعی، المنجد مادہ فسد

8۔ خلیل الجر لاروس، معجم العربی الحدیث، لاروس کنیدا، ۱۹۷۳م صفحہ ۹۰۸، مادہ فسد

9۔ ڈاکٹر عارف اللہ پی ایچ ڈی تھیسز، " اسلام اور دیگر ابراہیمی مذاہب کی اساسی نصوص کے تناظر میں انسداد فساد اور اقامت امن کا تقابلی مطالعہ صفحہ ۸۸)

10۔ راغب اصفہانی، الحسین بن محمد بن المفضل، المفردات فی غریب القرآن، الناشر نور محمد، اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب کراچی، ۱۹۶۱، صفحہ ۲۸۶ تا ۲۸۷ زیر مادہ فسد

11۔ ڈاکٹر عارف اللہ پی ایچ ڈی تھیسز، صفحہ ۸۹

12۔ابن تیمیہ، تقی الدین ابی العباس احمد ابن تیمیہ، کتاب الایمان، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۲۵ھ، صفحہ ۳۳، باب لفرق بین الاسلام والایمان، فصل ومن ہذاالباب الصلاح والفساد

13 ۔ڈاکٹر عارف اللہ پی ایچ ڈی تھیسز، صفحہ ۸۹

14۔ایضا صفحہ ۸۹

15۔البخاری امام ابو عبد اللہ اسماعیل، الصحیح البخاری، کتاب صلح، باب لیس الکاذب یصلح بین الناس، جلد ۴، صفحہ ۱۷۲ اردو مترجم مولانا محمد دائود راز، ناشر: مرکزی جمعیت الہ حدیث ہند، سن طباعت ۲۰۰۴م

16۔الکافی، جلد ۲، صفحہ ۲۱۰

17۔مفتی جعفر حسین (مترجم)، نہج البلاغہ، ناشر: معراج کمپنی اردو بازار لاہور پاکستان، طبع: سوم ۲۰۱۳م، خطبہ ۵۵

18۔البقرہ:۲۰۸

19۔الحجرات:۹

20۔مفتی جعفر حسین (مترجم)، نہج البلاغہ، ناشر: معراج کمپنی اردو بازار لاہور پاکستان، طبع: سوم ۲۰۱۳م، وصیت ۴۷، صفحہ ۵۷۷

21۔طوسی، محمد بن الحسن، (460ق) الأمالی (للطوسی)، ناشر: دار الثقافۃ، قم ایران، سال طبع: 1414ق، طبع: اول صفحہ ۵۲۲

22۔الترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسی بن سورۃ بن موسی بن الضحاک (المتوفی: 279ھ)، "الجامع الصحیح، المشہور باسم سنن الترمذی"، ناشر: دار الفکر، بیروت ۔لبنان، طبع سال 2000م ، الذبائح، ابواب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ ، باب، حدیث:2509،/ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی اصلاح ذات البین، حدیث:4919،

23۔نہج البلاغہ، مکتوب نمبر ۵۳، صفحہ ۵۹۸

24۔الانفال: ۶۱

25۔نہج البلاغہ، مکتوب نمبر ۵۳، صفحہ ۵۹۸

26۔النساء: ۱۱۴

27۔النساء: ۱۲۸

28۔نہج البلاغہ، مکتوب نمبر ۵۳، ص۵۹۸)

29۔ایضا

30۔انفال: ۶۲

31۔انفال:۶۱

32۔ نہج البلاغہ ،مکتوب نمبر ۵۳ ،ص۵۹۸

33۔ابن اشعث، محمد بن محمد، (المتوفی: ۴ھ)، "الجعفریات"، ناشر: مکتبۃ النبوی الحدیثۃ، تہران ایران،، ص ۳۶ہ

34۔آل عمران: ۹

35۔الروم: ۶۰

36۔ نہج البلاغہ ،مکتوب نمبر ۵۳ ،ص۵۹۸

37۔النحل: ۹۱

38۔ نہج البلاغہ ،مکتوب نمبر ۵۳ ،ص۵۹۸

39۔ایضاً

40۔ایضاً

41۔ایضاً،ص۵۹۹

42۔ایضاً

43۔ایضاً، خطبہ ۲۰۴، ص۴۴۸

44۔ایضاً

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

أَدِّبُوا أولادَكم على ثلاثِ خِصَالٍ:

حُبُّ نبيِّكم، وحُبُّ أهلِ بيتِه، وقراءةُ القرآنِ

(کنز العمال: ج۱۶، ص۴۵۶)

ترجمہ: اپنی اولادوں کے اندر تین خصوصیات پروان چڑھائیں:

- اپنے نبی ﷺ سے محبت؛
- نبی ﷺ کے اہل بیتؑ سے محبت
- اور قرآن کی تلاوت۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

من كان منكم مطيعا لله تنفعه ولايتنا ومن كان منكم عاصيا لله لم تنفعه ولايتنا۔

(کافی، ج۲، ص۷۵)

ترجمہ: "تم میں سے جو شخص اللہ کا فرمانبردار ہوگا اسے ہماری ولایت فائدہ دے گی اور جو نافرمان ہوگا اسے ہماری ولایت فائدہ نہیں دے گی۔"

واقعہ حرّہ، تاریخ کا ایک سیاہ ورق

ساجد علی گوندل*
sajidaligondal11@gmail.com

نظر ثانی: ڈاکٹر کرم حسین ودھو*

کلیدی کلمات: حرہ، حرہ واقم ، مدینہ، سیاسی حالات، امام سجادؑ، مسلم بن عقبہ ،یزید بن معاویہ، عبداللہ بن حنظلہ۔

خلاصہ

تاریخ نے جس واقعہ کو ن "حرہ واقم "کے نام سے یاد کیا ہے ،انسانی تاریخ کا درد ناک ترین واقعہ ہے۔ 63 ہجری یزید کے دور حکومت میں اہل مدینہ نے جب یزید کے فسق و فجور کو دیکھا تو پورے حجاز اور بالخصوص مدینے میں لوگوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ جب یہ خبر یزید کو ملی تو اس نے پہلے چند اپنے خاص افراد کے ذریعے اس آواز کو دبانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ جب یزید نے کہ دیکھا کہ لوگ اسے خلیفہ ماننے کو تیار نہیں ہیں تو تلوار کے زور پر اپنی خلافت منوانے کے لیے مسلم بن عقبہ کی قیادت میں ایک لشکر مدینے کی طرف روانہ کیا۔ شامی لشکر جب مدینے پہنچا تو بنی حارثہ کے ذریعے ، شہر کے گرد کھودی گی حفاظتی خندق کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی تو ان کی تلواروں کے رنگ اہل مدینہ کے خوں سے سرخ ہو گئے۔ انہوں نے کسی پر رحم نہ کیا، اصحاب رسول {ص} کو قتل کیا، لوگوں کی ناموس پر دست درازی کی، تاریخ نے نقل کیا ہے کہ اس واقع میں مدینے کی ایک ہزار کنواری لڑکی حاملہ ہوئی۔
تین دن تک مدینے میں ظلم کے سیاہ بادل چھائے رہے۔ اور پھر اس سب کے بعد جو لوگ زندہ بچے ، زبردستی ان کے گلے میں یزید کی غلامی کا طوق ڈال دیا گیا۔

* فاضل علوم اسلامیہ، مدرسہ امام خمینیؒ، قم
† ایسوسی ایٹ پروفیسر، ڈائریکٹر، ریجنل ڈائریکٹوریٹ آف کالجز (لاڑکانہ)

مقدمہ

لفظ انسان مادہِ اُنس سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح انسانیت یعنی وہ احساس کہ جو دوریوں کو ختم کرکے افراد کو قریب لاتا ہے۔ جہاں نفرت اور ظلم و تاریکی جیسے مفاہیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ پس انسان یعنی محبت کی فراوانی، ثریا کی بلندی، علم کا مرکز، جہالت کی ضد، اقدار کی دنیا، تہذیب کا گہوارہ، اپنوں کا خوبصورت احساس، خُلق میں احمد ﷺ شجاعت میں حیدرؑ، سخاوت میں حاتم اور سخن میں حافظ و سعدی و اقبال۔ پس اگر یہ انسان ہے تو پھر یہ ظلمت و تاریکی، یہ جبر و استبداد، یہ درندگی، یہ خون خرابہ، یہ نفرتیں، یہ گلوں کا کٹنا، بنت حوا کی سسکیاں، جہالت کے اندھیرے اور یہ ذلت کی پستیاں، یہ سب کیا ہے؟

اگر انسان اپنی خلقت سے سازگار فطری اصولوں کا دامن نہ چھوڑے، اور صراط مستقیم پر گامزن رہے تو یقیناً انسان الفت و محبت کی ایک ایسی روحانی دنیا ہے کہ جس پر ملائکہ نازاں ہیں۔ مگر تاریخ انسانیت میں جیسے ہی انسان نے فطری راستوں کو پشت دکھائی تو قدم بہ قدم ظلمت کی اندھیری وادیوں میں دھنستا چلا گیا۔ اور بالآخر اس مقام پر پہنچا کہ جہاں اگر اسے درندہ بھی کہا جائے تو یہ دراصل صفت درندگی کی توہین ہوگی۔ تاریخ کے دامن میں ایسے بہت سارے واقعات ہیں کہ جن سے خود انسانیت شرمندہ ہے۔ اور واقعہ حرہ اس کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ تاریخ میں اس طرح کے واقعات کا ظہور جہاں انسانیت کے لیے باعث ننگ و عار ہے وہیں اگر ان جیسے واقعات کا صحیح معنوں میں ، مختلف زاویوں سے جائزہ لیا جائے تو انسان پر اس کی زندگی کے بہت سارے مبہم و پنہان پہلو واضح ہوتے ہیں۔ لہٰذا محققین و اہل نظر کو چاہیے کہ کم از کم تاریخ اسلام میں رونما ہونے والے ایسے انسان سوز واقعات کی اس انداز سے تحقیق کریں کہ جس سے ان کے مبہم و تاریک پہلو کھل کر سامنے آجائیں۔ کیونکہ تاریک نویسی میں حکمرانوں کا تسلط اور پھر تاریخی واقعات میں راویوں کا تضاد اس کے اصلی چہرے کو مسخ کرنے کے لیے کافی ہے۔

تاریخ اسلام میں باقی واقعات کی مانند واقع حرہ بھی ان واقعات و حوادث میں سے ہے کہ جس کے متعلق انسانی ذہن میں بہت سارے سوالات جنم لیتے ہیں۔ جیسا کہ اس قیام میں مدینے کے لوگوں کا حقیقی

مقصد و محرک کیا تھا؟ ان کی سوچ کیا تھی؟ ان کے سیاسی رہنما و سربراہ کون تھے؟ اس واقعے کے اصلی علل واسباب کیا تھے؟ اس قیام کا قیام حسینیؑ سے کیا ربط تھا؟ اور پھر امام سجادؑ کا اس قیام سے کیا تعلق تھا؟

حرہ کا معنٰی

کالے رنگ کے سخت پتھروں والی زمین کو حرہ کہتے ہیں(1)۔ کیونکہ مدینے کے اطراف میں بہت سارے ایسے پتھریلے حصے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کو اس پر رہنے والے قبیلے کے نام سے منسوب کیا جاتا (2)۔ کہا جاتا ہے کہ واقم عمالیق قبیلے میں سے کسی شخص کا نام یا مدینے کے قلعوں میں سے کسی قلعے کا نام تھا(3)۔ کیونکہ یہ قیام مدینے سے مشرقی جانب حرہ واقم یا حرہ زھرہ نامی جگہ سے شروع ہوا، لہٰذا تاریخ میں اسے واقع حرہ کے نام سے شہرت ملی(4)۔ اگر اسے حِرہ زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو عطش و پیاس کے معنی میں ہے۔

واقعہ حرہ کا آغاز:

اکثر تاریخی منابع میں واقعہ حرہ کے آغاز کو 63 ہجری 27 یا 28 ذی الحجہ لکھا گیا ہے(5)۔ لہٰذا جنہوں نے اس واقع کو 62 ہجری میں ذکر کیا ہے انہوں نے تاریخی اشتباہ کیا ہے(6)۔ اس حادثے کی دو تاریخیں ذکر کی گئی ہیں:

1. یہ واقعہ 63 ہجری 27 ذی الحجہ کو پیش آیا۔(7)
2. یہ واقعہ 63 ہجری 28 ذی الحجہ کو پیش آیا۔(8)

جغرافیا:

حرہ کا مقام مدینے کے مشرقی جانب واقع ہے۔ یاقوت حمودی نے البلدان میں اسے یوں نقل کیا ہے "حرۃ واقم احدی احرق المدینۃ ، وھی الشرقیۃ، سمیت برجل من العمالیق ، اسمہ واقم "(9) یعنی: "حرہ واقم مدینے کے مشرقی جانب واقع ایک مقام کا نام ہے۔ اور اس کا یہ نام عمالیق قبیلے میں سے "واقم" نامی شخص کی نسبت سے ہے۔"

جب مسلم بن عقبہ اپنے شامی لشکر کے ساتھ مدینے پہنچا تو اس نے اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ پڑاو ایسی جگہ اور اس انداز سے ڈالا جائے کہ جب سورج طلوع کرے تو ان کی پشت کی جانب سے بلند ہو، تاکہ مقابلے کے وقت سورج کی کرنیں اہل مدینہ کو بالکل سامنے سے پڑیں۔ پس اس لحاظ سے حرہ واقم ان کے لیے ایک مناسب جگہ تھی۔ بلاذری نے اس مطلب کو یوں نقل کیا ہے: ولما اقبل مسلم بن عقبة من الشام، فقال انزلونی منزلا اذا حاربت القوم استدبرتنی الشمس واستقبلتهم، فنزل بحرة واقم، شرق المدينة (10)۔

مدینہ واہل مدینہ کی فضیلت

اس شہر کی عظمت و فضیلت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ طول تاریخ اسلام میں یہ شہر بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس کی فضیلت میں بہت ساری روایات نقل ہوئی ہیں۔ اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ اہل مدینہ کے بارے میں بھی تاریخ نے بہت کچھ ذکر کیا ہے۔ نمونے کے طور پر یہاں مندرجہ ذیل چند روایات کو ذکر کیا گیا ہے۔ عن حسان بن مهران قال ـــــ عن امير المومنين ع، مكة حرم الله و المدينة حرم رسول الله و الكوفة حرمي، لايريدها جبار بحادثة الا قصمه الله (11)۔

یعنی: "حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ: مکہ حرم خدا ہے اور مدینہ، حرم رسول خدا ﷺ ہے جبکہ کوفہ میرا حرم ہے۔ ہر وہ شخص کہ جو ان شہروں کی نسبت ظلم و ستم کا ارادہ کرے تو خداوند متعال اسے نیست و نابود کر دے گا۔"

اسی طرح ایک اور روایت میں یوں نقل ہوا ہے۔

عن جميل بن درّاج، قال: سمعت اباعبدالله يقول: قال رسول الله [ص]: من احدث بالمدينة حدثاً او آوى محدثاً فعليه لعنة الله، قلتُ: وماالحدث؟ قال: القتل (12)۔

یعنی: "رسول خدا [ﷺ] نے فرمایا: اللہ کی لعنت ہو اس شخص پر کہ جو مدینے میں ناشائستہ کام انجام دے، اور اس پر بھی کہ جو اس شخص کو یہاں پناہ دے۔ راوی کہتا ہے میں نے سوال کیا، یارسول اللہ [ﷺ] ناشائستہ کام سے آپ کی کیا مراد ہے؟ تو آپ [ﷺ] نے فرمایا: قتل و

غارت۔" اسی طرح اہل مدینہ کے بارے میں کچھ یوں نقل ہوا ہے:من اخاف اهل المدينة ظالما ، لهم اخافه الله و كانت عليه لعنة الله (13)۔

اس طرح کی اور بھی بہت ساری روایات ہیں کہ جن میں مدینے کی فضیلت کا ذکر ہوا ہے اور اہل مدینہ پر ظلم و ستم روا رکھنے والوں سے برائت کا اظہار کیا گیا ہے۔ان جیسی روایات کے مد نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جو شخص بھی اہل مدینہ پر ظلم و ستم کرے اس پر اللہ کی لعنت برستی ہے۔

واقعہ حرہ سے پہلے مدینے کے سیاسی حالات

جیسا کہ تاریخی منابع سے یہ بات ثابت ہے کہ حجاز کے لوگ خلیفہ اول و دوم کے کردار و گفتار کو پسند کرتے جبکہ اس کے برعکس شامیوں کا امویوں کی طرف رجحان تھا۔اسی وجہ سے حجازیوں کو "بو بکری و عمری" بھی کہا جاتا۔ اگر شہر مدینہ کی بات کی جائے تو اس میں مہاجر و انصار ہر دو طرح کے افراد موجود تھے۔اور خلیفہ دوم نے اپنے زمانے میں اہل مدینہ کے ساتھ حسن سلوک سے کام لیا اور اہل مدینہ پر اپنے جود و بخشش کی برسات کی۔ مگر خلیفہ سوم کے قتل کے بعد حالات یکسر ہی تبدیل ہوگے۔ جیسے ہی حکومت کی باگ دوڑ بنو امیہ کے پاس آئی تو اہل مدینہ پر سخت حالات نے گھیرا ڈال لیا۔ معاویہ و یزید نے جو سخت رویہ اہل مدینہ کے ساتھ اختیار کیا وہ مدینے کے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔اور دوسری جانب قیام حسینی کے بعد لوگوں نے یزید کا اصلی چہرہ محسوس لیا تھا۔اور اس کے علاوہ امویوں کی طرف سے مدینے میں مقرر کئے گئے بد عنوان حکمران سبب بنے کہ مدینے کے لوگوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانا شروع کر دی۔اور پھر سرزمین حجاز میں ابن زبیر کا امویوں کے خلاف آواز بلند کرنا، مدینے کے لوگوں کے لیے حوصلہ افزا امر تھا۔اور پھر جیسے ہی مدینے کی چند نمایاں شخصیات نے اموی حاکم یزید کے اعمال کو قریب سے دیکھا تو عملی طور پر یزید کی حکومت کے خلاف صف آرائی شروع کر دی (14)۔

علل واسباب اور انداز فکر

اگر واقعہ حرہ کے اسباب کے بارے بات کی جائے تو اس سلسلے میں ہمیں تین انداز فکر یا زاویۂ نگاہ نظر آتے ہیں۔اس بارے میں ہمارے پاس تاریخی روایات موجود ہیں کہ جن میں سے ہر روایت ایک خاص زاویے کو بیان کرتی ہے۔ یہاں ضروری ہے کہ ان تینوں کا ذکر کیا جائے۔

بلاذری روایت کرتا ہے کہ "جب عبداللہ بن مطیع نے اپنے بھائی عمرو کو قتل کیا اور لوگوں کو یزید کے خلاف جہاد کی دعوت دی تو اس پر لوگوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا۔ پس یہ مدینے کے لوگوں سے ابن زبیر کے لیے بیعت لینے لگا۔ جب یزید کو اس واقع کی خبر ملی تو اس نے اپنے مقرر کردہ والی عثمان بن محمد بن ابو سفیان کو پیغام بھیجا کہ وہ اہل مدینہ میں سے چند برجستہ شخصیات کو لے کر شام کا رخ کرے (15)۔

جبکہ یعقوبی کی روایت کے مطابق: "عثمان بن محمد جب والی مدینہ بنا تو ابن مینا نامی شخص جب اموال "صوافی" (16) کو مدینہ سے شام کی طرف خلیفے کے لیے لے جانے لگے تو ایک گروہ نے اس کی شدید مخالفت کی، اور کہا کہ یہ مال ہمارا ہے۔ پس اس قضیے پر والی مدینہ اور لوگوں کے درمیان نزع اس قدر بڑھا کہ لوگوں نے اس قدر شورش بلند کی کہ امویوں کو شہر سے نکال دیا۔" (17)

اور طبری نے کچھ یوں روایت نقل کی ہے: "عثمان بن محمد نے مدینے کی ولایت سنبھالتے ہی یزید کی فرمائش پر وہاں سے بزرگان کے ایک گروہ کو شام کی طرف بھیجا تاکہ وہ قریب سے یزید کی سخاوت و بخشش کو دیکھیں۔ یہ گروہ تو گیا مگر واپسی پر بجائے اس کے یہ مدینے کے لوگوں کے سامنے یزید کی تعریف کرتے، انہوں نے یزید کی برائیوں کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ اور کہا "لیس له دین، یشرب الخمر، یعزب بالطنابیر و یضرب عنده القیان و یلعب بالکلاب" یعنی: ہم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہیں کہ جس کا کوئی دین نہیں، جو شراب پیتا ہے۔ لہو و لعب کی محفلوں اور موسیقی کا عادی ہے اور کتوں سے کھیلتا ہے۔ لہٰذا ہم ایسے شخص کی اطاعت کو قبول نہیں کرتے اور اسے خلیفہ نہیں مانتے۔" (18)

ان روایات کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس واقع میں تقریباً ان ذکر شدہ تمام اسباب کا عمل دخل ہے۔ اگرچہ اس قیام میں مدینے کے لوگوں نے قیامِ کربلا سے اثر لیا، مگر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس قیام کی فکری و سیاسی ماہیت قیامِ کربلا سے مربوط ہے۔ بلکہ اس قیام کا اصلی محرک اہل مدینہ کا یزید جیسے فاسق و فاجر شخص کے کارناموں کو قریب سے دیکھنا، اور ساتھ ساتھ حجاز و مدینے میں زبیریوں کا نفوذ تھا۔ جیسا کہ ابن قتیبہ اور دینوری نے اس قیام کو قیامِ ابن زبیر سے مربوط کیا ہے (19)۔

اسی طرح مسعودی نے بھی یہی کہا ہے کہ مدینے سے امویوں کا اخراج عبداللہ بن زبیر کی ایماء پر کیا گیا، یعنی اہل مدینہ کے قیام کو ابن زبیر سے مربوط قرار دیا ہے (20)۔ اور پھر اعثم کوفی نے بھی اس بات کو اسی طرح ہی نقل کیا ہے کہ ابن زبیر نے عبداللہ بن حنظلہ کو والی مدینہ منتخب کیا (21)۔

پس اس طرح کی روایات سے باآسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اس قیام نے ابتدائی طور پر قیام حسینیؑ سے جوش وجذبہ حاصل کیا ہے۔ اور اہل مدینہ نے اپنے واپنے اہل خانہ کے حقوق کی حفاظت اور یزید کی عیاریوں کے خلاف آواز بلند کی، مگر تدریجاً اور نہایۃً اس میں زبیری فکر نے نفوذ کیا۔ مدینہ کیونکہ جغرافیائی اعتبار سے دمشق ومکہ کے درمیان واقع ہے اور دونوں کے لیے معاشی وسیاسی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا زبیریوں نے اپنے سیاسی اہداف کے حصول کے لیے اس تحریک کو اپنی جانب موڑ لیا۔

واقعہ حرہ

جیسے ہی مدینے میں ہونے والی شورش کی خبر یزید تک پہنچی تو اس نے عبداللہ بن جعفر وبشیر بن نعمان کہ جو انصار میں سے امویوں کا حامی تھا، کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے اور کنٹرول کرنے کی کافی کوشش کی مگر لوگوں نے ان کی ایک نہ سنی (22)۔ مدینے کے لوگوں نے عبداللہ بن حنظلہ کی سربراہی میں عثمان بن محمد [والی مدینہ] کو عہدے سے ہٹا دیا اور عبداللہ بن حنظلہ کی بیعت کر لی۔ ابن اعثم کوفی کے مطابق عبداللہ بن حنظلہ ابن زبیر کی طرف سے والی مدینہ مقرر ہوا (23)۔ اور لوگوں نے مروان کے گھر موجود امویوں کا محاصرہ کرلیا جو کہ تقریباً 1000 افراد تھے (24)۔ جیسے ہی ان حالات کی خبر یزید تک پہنچی تو اس نے مسلم بن عقبہ کی سربراہی میں ایک لشکر مدینے کی طرف روانہ کیا۔ اور شام کے لوگوں سے کہا کہ جو بھی مسلم کے لشکر میں شامل ہوگا، اسے 100 دینار اضافی دیئے جائیں گے (25)۔ یہ سنتے ہی بہت سارے شامی اس لشکر میں شامل ہوگے۔ مسلم بن عقبہ کی سربراہی میں جو لشکر مدینے کی طرف آیا اس کی تعداد 5000 سے 27000 تک لکھی گی ہے (26)۔

ادھر مدینے کے لوگوں نے امویوں کو اس شرط وعہد پر شہر سے باہر جانے کی اجازت دی کہ ان میں سے کوئی بھی نہ تو شامی لشکر میں شامل ہوگا، اور نہ ہی کوئی ان کے سامنے مدینے کی کوئی خبر فاش

کرے گا (27)۔ اسی دوران مجموعی طور پر مکہ و مدینے سے نکالے جانے والے افراد کی تعداد کو 4000 تک شمار کیا گیا ہے (28)۔ جب مسلم کی سربراہی میں لشکر نے مدینے کی طرف حرکت کی تو یزید نے مسلم کو حکم دیا کہ: ادع القوم ثلاثاً فان رجعوا الی الطاعة فاقبل منهم و کف عنهم و الا فاستعن بالله و قاتلهم. و اذا ظهرت علیهم فابح المدینه ثلاثاً ثم اکفف عن الناس یعنی: "جاؤ اور اہل مدینہ کو تین دن کی مہلت دو تاکہ وہ میری اطاعت میں آجائیں پس اگر وہ اطاعت کرلیں تو ان سے صرف نظر کرو۔ اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان سے جنگ کرو اور ان کا خون بہاؤ۔ اور جب ان پر غلبہ پالو تو تین دن تک مدینے کو اپنے لشکریوں پر حلال قرار دو۔" (29)

پس جیسے ہی اہل مدینہ کو اس لشکر کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے دفاع کے لیے شہر کے اطراف میں ایک خندق کھودی تاکہ دشمن اسے پار کرکے شہر کی حدود میں داخل نہ ہو سکے۔ شامی لشکر جب مدینے پہنچا تو انہوں نے حرہ واقم نامی جگہ پر پڑاو ڈالہ۔ اور یہاں ہی عبدالملک بن مروان ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ اس نے اپنے کیے ہوئے عہد کا کچھ بھی پاس نہ رکھتے ہوئے، مسلم کے ساتھ مل کر شہر پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مروان نے قبیلہ بنی حارثہ کے چند افراد کو مال و زر کا لالچ دے کر، ان کی مدد سے شامی فوج کو مدنیے کے اندر داخل کردیا (30)۔

جیسے ہی شامی فوج مدینے میں داخل ہوئی تو اس نے قتل و غارت کا بازار گرم کردیا۔ ہر طرف خون ہی خون تھا مدینے میں موجود کوئی مرد و عورت، بچہ، بوڑھا و جوان ایسا نہ تھا کہ جو ان کے ظلم و ستم کا شکار نہ ہوا ہو۔ تاریخی منابع میں اس حادثے میں قتل ہونے والوں کی تعداد کو 10700 سے 11700 تک لکھا گیا ہے (31)۔ راوی نقل کرتا ہے: قتل من اصحاب النبی (ص) ثمانون رجلاً و من قریش و الانصار سبع مئة. ومن سائر الناس من االموالی و العرب و التابعین عشرة آلاف یعنی: "اس واقعے میں قتل ہونے والوں میں 80 افراد اصحاب رسول {ص} میں سے، 700 مہاجرین و انصار میں سے جبکہ باقی موالی و تابعین میں سے 10000 افراد قتل ہوئے۔" (32) اس بارے میں مسعودی یوں رقم دراز ہیں: قتل من آل ابی طالب اثنان و من بنی هاشم ثلاثلة و بضع و تسعون رجلاً. من سائر قریش و مثلهم من الانصار و اربعة آلاف من سائر الناس و دون من لم یعرف. یعنی: " اس

حادثے میں خاندان ابو طالب میں سے دو افراد اور بنی ہاشم و قریش میں سے تقریباً نوے سے زیادہ افراد جبکہ ان کے علاوہ باقی چودہ ہزار لوگوں کو قتل کیا گیا۔" (33)

اسی طرح ایک اور جگہ تاریخ نے اس مطلب کو یوں نقل کیا ہے: قتل یوم الحرۃ سبعمائۃ من حملۃ القرآن و کان فیھم ثلاثۃ من اصحاب النبی {ص} یعنی: "واقع حرہ میں قتل ہونے والے افراد میں سے 700 افراد حافظان قرآن تھے کہ جن میں سے تین صحابی رسول تھے۔" (34)

المختصر شامی فوج نے مدینے میں اخلاقی اقدار کو خوب پامال کیا۔ اور انسانیت سے گرے ہوئے ہر اس کام کو انجام دیا کہ جس سے روح انسانیت کانپ اٹھے۔ اور ظلم کی وہ داستان رقم کی کہ جسے پڑھ کر دل دہل جائیں۔

نقل ہوا ہے کہ اسی دوران ایک شامی، ابن ابی کبشہ انصاری کے گھر داخل ہوا۔ ابن ابی کبشہ کی زوجہ نے اسی وقت بچے کو جنم دیا تھا۔ شامی نے گھر میں داخل ہوتے ہی اس خاتون سے سوال کیا کہ، کیا گھر میں کوئی ایسی چیز ہے کہ جسے میں لوٹ کر لے جاوں؟ اس خاتون نے کہا کہ اللہ کی قسم یہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ پس اس شامی نے غصے کی حالت میں اس نو مولود کو اٹھایا اور دیوار پر اس طرح دے مارا کہ اس معصوم بچے کا مغز باہر آگیا۔ کہتے ہیں کہ وہ شامی ابھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا کہ اس کے چہرے کا بعض حصہ سیاہ ہونے لگا (35)۔

مالک بن انس سے نقل ہوا ہے کہ: وقد اختفی جماعۃ من سادات منھم جابربن عبداللہ و خرج ابو سعید الخذری ملجأ الی غار فی جبل یعنی: ''اس کے علاوہ بہت سارے افراد ایسے تھے کہ جو اپنی جان بچانے کے لیے مخفی ہو گے۔ اور انہوں نے پہاڑوں میں پناہ لی کہ جن میں قابل ذکر نام، جابر بن عبداللہ انصاری اور ابو سعید خذری ہیں (36)۔"

خلیفہ بن خیاط نے اپنی کتاب میں ان تمام افراد کے نام ذکر کیے ہیں کہ جو اس ہولناک واقع میں قتل ہوئے (37)۔ جبکہ واقعہ حرہ نامی کتاب میں صاحبِ کتاب نے ایک فہرست میں مشہور مقتولین کی تعداد اور قبیلے کو ذکر کیا ہے۔

فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

مہاجرین {قریش: 145 افراد

قبیلہ اوس: 66 افراد

قبیلہ خزرج: 137 افراد

عدنانی قبائل: 25 افراد

قحطانی قبائل: 22 افراد

ہم پیمانِ قریش: 16 افراد

ہم پیمانِ انصار: 10 افراد

موالی {غلام}: 8 افراد

یہ وہ مشہور افراد ہیں کہ جن کے نام تاریخی منابع میں نقل ہوئے ہیں اگرچہ مجموعی طور پر مقتولین کی تعداد بہت زیادہ ہے (38)۔

ذہبی اس واقعے کے متعلق یوں لکھتے ہیں کہ " واقعہ حرہ میں اصحاب و تابعین و مہاجرین و انصار کا قتل کیا گیا، مسجد نبوی کی حرمت کو پامال کیا گیا حتیٰ اس میں گھوڑے باندھے گے اور روضہ رسول {ﷺ} کو آلودہ کیا گیا (39)۔

خواتین کی عصمت دری

جب شامیوں نے اہل مدینہ پر غلبہ پا لیا تو مسلم بن عقبہ نے یزید کے دستور کے مطابق، تین دن تک مدینے کے لوگوں کی جان و مال و ناموس کو اپنے سپاہیوں پر حلال کر دیا۔ اس بات کو ابن کثیر نے یوں بیان کیا ہے: ثم اباح مسلم بن عقبه الذی یقول فیه السلف مسرف بن عقبه . قبحه الله من شیخ سوء ماأجهله المدینة ثلاثة ایام کما امره یزید ---الی الآخر یعنی: " مسلم بن عقبہ {کہ جس نے مدینے میں اس قدر لوگوں کو قتل کیا کہ اسے مسرف کہا جانے لگا} نے یزید کے حکم کے مطابق تین دن تک مدینے کو اپنے سپاہیوں پر حلال قرار دیا (40)۔"

شامیوں نے تین دن تک اہل مدینہ کی ناموس کو اس قدر پامال کیا کہ جس کے نتیجے میں ایک سال بعد، مدینے میں 1000 ولد الزنا بچوں کی پیدائش ہوئی۔ اس مطلب کو ابن کثیر نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

قال المدائنی من ابی قرة قال: قال هشام بن حسان : ولدت الف امراة من اهل مدینة بعد وقعة الحرة من غیر زوج . یعنی: واقعہ حرہ کے بعد مدینے کی ایک ہزار کنواری لڑکیوں نے بچوں کو جنم دیا (41)۔

بدر کے مشرکین کا بدلہ

بہت سارے علماء اہل سنت نے اس بات کو نقل کیا ہے کہ واقعہ حرہ میں یزید اور باقی امویوں نے بدر میں مارے جانے والے اپنے مشرک مقتولین کے بدلے کے عنوان سے، بالخصوص انصار کو ایسے قتل کیا، یہاں تک کہ ایک بدری صحابی بھی باقی نہ بچا (42)۔

اور اہل مدینہ کے حالات کو سن کر خوشی کی حالت میں یزید کا، مشرک عبداللہ بن زبعری کا شعر پڑھنا، خود اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حرہ میں انصار کا قتل بدری مشرکین کا بدلہ تھا۔ تاریخ میں نقل ہوا ہے کہ جب یزید نے مدینے کے حالت سنے تو مندرجہ ذیل شعر پڑھا۔

ےلیت اشیاخی ببدر شهدوا　　جزع الخزرج من وقع الاسل

کاش میرے وہ بزرگ کہ جو بدر میں قتل ہوگے، آج دیکھتے کہ قبیلہ خزرج نے کتنی کاری ضرب کھائی ہے۔

لاهلوا و استهلوا فرحاً　　ولقالوا یایزید لا تشل

یہ سب دیکھ کر وہ خوشی کی حالت میں بلند صدا دیتے اور میرا شکریہ ادا کرتے۔

فجزیناہ ببدر مثلاً　　و اقمنامثل بدر فاعتدل

آج ہم نے ان کو بدر کا صلہ دے دیا ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا، ہم نے انہیں پلٹا دیا ہے۔

لست من خندف ان لم انتقم　　من بنی احمد ماکان فعل (43)

اور میں خندف (44) کا بیٹا ہی نہیں ہوں کہ اگر بنی احمد {ذریت رسول ﷺ} سے انتقام نہ لوں۔

اہل مدینہ و غلامی کا طوق

پس جب قتل و غارت کا یہ بازار کچھ ٹھنڈا ہوا تو مسلم بن عقبہ نے باقی بچے تمام افراد کو اکٹھا کیا۔ اور ان سے یزید کے لیے اس انداز سے بیعت لی کہ وہ خود بھی اور ان سب کے ماں باپ بھی یزید کے غلام ہیں۔ تاریخ نے اس بات کو یوں نقل کیا ہے: فدخل مسلم بن عقبه المدينة فدعا الناس للبيعة على انهم خول ليزيد بن معاوية، ويحكم فى دمائهم و اموالهم و اهليهم ما شاء

یعنی: "جب مسلم بن عقبہ مدینے میں داخل ہوا تو اس نے لوگوں کو کہا کہ، تم لوگ یزید بن معاویہ کی بیعت اس انداز سے کرو، کہ وہ جب اور جیسے چاہے تمہاری جان، مال و ناموس تصرف میں لائے (45)۔"

اور جو اس حکم سے سر پیچی کرتا اس کی گردن اڑادی جاتی (46)۔اس بیعت سے صرف دو لوگ خارج تھے۔امام سجاد { علیہ السلام } اور علی بن عبداللہ (47)۔

امام سجاد { ع } اور واقعہ حرہ

امام زین العابدین علیہ السلام نے اس قیام میں حصہ نہ لیا۔ اور اس قضیے میں بے طرفی اختیار کی۔ کیونکہ امامؑ جانتے تھے کہ اس قیام کی بھاگ دوڑ زبیریوں کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا امامؑ اس شورش کا حصہ نہ بنے لہٰذا شامی لشکر کو بھی امامؑ سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بلکہ اس واقعے میں امام سجادؑ کا گھر امان گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ اس واقعہ میں ایک طرف امویوں کا فتنہ تھا، کہ جس کے بارے میں حضرت علیؑ نے فرمایا: الا و ان اخوف الفتن عندی بنی امیه . فانها فتنه عمیاء عظیمة یعنی :آگاہ رہو کہ میری نظر میں سب سے بڑا اور خطرناک ترین فتنہ ، فتنۂ بنوامیہ ہے۔

اور دوسری جانب دوسری جانب زبیریوں کا فکری جال، لہٰذا امامؑ نے ایسی حالت اس واقعے سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اور اس حکمت پر عمل کیا کہ جس میں امام علیؑ نے ارشاد فرمایا کہ: کن فی الفتنة کابن اللبون لاظهر فیرکب ولا ضرع فیحلب یعنی: " فتنوں کے زمانے میں اونٹ کے اس دو سالہ بچے جیسے ہو جاو کہ جس کی پیٹھ اس قابل نہیں ہوتی کہ اس پر سواری کی جاسکے اور نہ ہی اس کے پستان اس قابل ہوتے ہیں کہ ان سے دودھ دویا جاسکے (48)۔

رسول خداﷺ کی پیش گوئی

تاریخ میں یہ بات نقل ہوئی ہے کہ ایک دن رسول خداﷺ حرہ واقم کے علاقے سے گزر رہے تھے کہ اچانک آپ ﷺ نے پڑھا :انا للہ و انا الیہ راجعون، صحابہ ڈر گے کہ شاید سفر میں کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے۔ رسول خداﷺ نے فرمایا: کہ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے کلمہ استرجاع اس لیے نہیں پڑھا کہ ابھی کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے، بلکہ یہ جس جگہ کو تم دیکھ رہے ہو، عنقریب میری امت کے برجستہ افراد یہاں قتل کیے جائیں گے (49)۔

نتیجہ

1۔ قرآن میں "فساد فی الارض" اور ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا نہ فقط انسانوں، بلکہ مسلمانوں اور اصحابِ رسول اور اہلِ مدینہ کا بے دردی سے خون بہانے والا سفاک شخص، دائرہ اسلام و ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔

2۔ اللہ تعالی نے ایک مومن کو جان بوجھ کر قتل کرنے کی سزا لعنت کا طوق اور جہنم قرار دی ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُۥ جَهَنَّمُ خَٰلِدًا فِيهَا وَغَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُۥ وَأَعَدَّ لَهُۥ عَذَابًا عَظِيمًا یعنی: "اور جو بھی کسی مومن کو قصدا قتل کردے گا اس کی جزا جہنم ہے۔ اسی میں ہمیشہ رہنا ہے اور اس پر خدا کا غضب بھی ہے اور خدا لعنت بھی کرتا ہے اور اس نے اس کے لئے عذابِ عظیم بھی مہیا کر رکھا ہے۔"(50)

*****

حوالہ جات

1۔ خلیل بن احمد، کتاب العین، لفظ حرہ کے ذیل میں

2۔ دایرہ المعارف الاسلامیہ جلد ۷ ص ۳۶۳

3۔ حمودی، یاقوت بن عبداللہ، معجم البلدان، ذیل حرہ واقم

4۔ ایضاً

5۔ دینوری، ابن قتیبہ، عبداللہ بن مسلم، الامامۃ والسیاسۃ، جلد ۱، ص ۱۸۵ / بلاذری، احمد بن یحیٰی، انساب الاشراف جلد ۴ قسم ۲ ص ۴۱

6۔ یعقوبی، الاحمد بن اسحاق، تاریخ یعقوبی، جلد ۲ ص ۲۵۱

7۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار، جلد ۱۸، ص ۱۲۶

8۔ الاستیعاب، جلد ۳ ص ۹۵۹

9۔ حمودی، یاقوت بن عبداللہ، معجم البلدان جلد ۲ ص ۲۴۹

10۔ بلاذری، احمد بن یحیٰی، انساب الاشراف، جلد ۵ ص ۳۳۴
11۔ کلینی، یعقوب، الکافی، جلد ۴، ص ۵۶۳
12۔ الکافی، جلد ۴ ص ۵۶۵
13۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی، فتح الباری، جلد ۴ ص ۹۴
14۔ جعفریان، رسول، تاریخ خلفاء، از رحلت پیامبر تا زوال امویان جلد ۲ ص ۵۷۳ و ۵۷۴۔۔۔۔۔/
دینوری، ابن قتیبہ، عبداللہ بن مسلم، الامامۃ والسیاسۃ، جلد ا ص ۲۰۶ و ۲۰۷
15۔ بلاذری، احمد بن یحیٰی، انساب الاشراف، ج ۴ ص ۳۱۔۔۔۔۔۔۔۔/
جعفریان، رسول، تاریخ خلفاء، از رحلت پیامبر تا زوال امویان، ج ۲ ص ۵۷۳ و ۵۷۴
16۔ وہ مال کہ جسے خلیفہ کی نسبت دی جاتی اور خلیفہ کا حق سمجھا جاتا
17۔ یعقوبی، الاحمد بن اسحاق، تاریخ یعقوبی، جلد ۲ ص ۲۵۰
دینوری، ابن قتیبہ، عبداللہ بن مسلم، الامامۃ والسیاسۃ، جلد ا ص ۲۰۶ و ۲۰۷
18۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری، جلد ا ص ۳۶۸، بلاذری، احمد بن یحیٰی، انساب الاشراف جلد ۴ ص ۳۱
19۔ المعارف، ۳۱۵۔۔۔۔۔۔۔۔و۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اخبار الطوال، ص ۲۶۴
20۔ مسعودی، ابوالحسن علی بن الحسین، مروج الذہب جلد ۳ ص ۷۸
21۔ ابن اعثم کوفی، کتاب الفتوح، جلد ۵ ص ۱۵۶ و ۱۵۷
22۔ دینوری، ابن قتیبہ، عبداللہ بن مسلم، الامامۃ والسیاسۃ، جلد ا ص ۲۰۶ و ۲۰۷، طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری، جلد ۴ ص ۳۶۷
23۔ ابن اعثم کوفی، کتاب الفتوح، جلد ۵ ص ۲۹۲ و ۲۹۳
24۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری جلد ۴ ص ۳۷۰، بلاذری، احمد بن یحیٰی، انساب الاشراف، ج ۴ ص ۳۲
25۔ بلاذری، احمد بن یحیٰی، انساب الاشراف، ج ۴ ص ۳۲
26۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری، جلد ۵ ص ۴۸۳/ یعقوبی، الاحمد بن اسحاق، تاریخ یعقوبی، جلد ۲ ص ۲۵۰
27۔ دینوری، ابن قتیبہ، عبداللہ بن مسلم، الامامۃ والسیاسۃ، جلد ا ص ۲۱۰
28۔ بلاذری، احمد بن یحیٰی، انساب الاشراف، ج ۴ ص ۳۷
29۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، البدایۃ والنھایۃ، جلد ۸ ص ۲۳۹
30۔ دینوری، ابن قتیبہ، عبداللہ بن مسلم، الامامۃ والسیاسۃ، جلد ا ص ۲۱۱
31۔ مسعودی، ابوالحسن علی بن الحسین، تنبہ، ص ۳۰۵
32۔ دینوری، ابن قتیبہ، عبداللہ بن مسلم، الامامۃ والسیاسۃ، جلد ا ص ۲۳۹

33۔ مسعودی، ابوالحسن علی بن الحسین، مروج الذھب جلد ۳ ص ۸۵
34۔ فسوی، یعقوب بن سفیان، المعرفۃ والتاریخ جلد ۳ ص ۳۲۵
35۔ امامت و سیاست، فارسی ترجمہ، ص ۲۵۵
36۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، البدایۃ والنھایۃ، جلد ۸ ص ۲۴۱
37۔ خلیفہ بن خیاط، ابو عمرو بن ابی ھبیرہ، تاریخ خلیفہ بن خیاط، قسم ا ص ۲۹۳ تا ۳۱۴
38۔ فاضل عبدالجبل الزاکی، واقع حرہ ص ۴۴۶ تا ۴۵۵
39۔ سیر اعلام النبلاء، جلد ۴ ص ۲۲۸
40۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، البدایۃ والنھایۃ، جلد ۸ ص ۲۴۱
41۔ ایضاً
42۔ دینوری، احمد بن داوود، الاخبار الطوال ص ۲۶۷/ بلاذری، احمد بن یحیٰی، انساب الاشراف، جلد ۴ قسم ۲ ص ۴۰ تا ۴۲
43۔ دینوری، احمد بن داوود، الاخبار الطوال ص ۲۶۷/ بلاذری، احمد بن یحیٰی، انساب الاشراف جلد ۴ ص ۴۲
44۔ "خندف" الیاس بن مضر بن نزار کی ہمسر لیلا بن حلوان کا لقب ہے۔ تاریخ میں الیس کے فرزندان کو خندف کے نام سے شہرت ملی ہے۔ نیز یزید کا شجرہ بھی ان سے جاملتا ہے۔ تاریخ طبری، جلد ا ص ۲۴ و ۲۵
45۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، البدایۃ والنھایۃ، جلد ۸ ص ۲۴۳
46۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری، جلد ۴ ص ۳۷۸
47۔ مسعودی، ابوالحسن علی بن الحسین، التنبہ ص ۲۶۴
48۔ نہج البلاغہ، حکمت نمبر ا
49۔/ فسوی، یعقوب بن سفیان، المعرفۃ والتاریخ، جلد ۳ ص ۳۲۷/ بحار الانوار جلد ۱۸ ص ۱۲۵
50۔ نساء: ۹۳

1. قال رسول اللہ ﷺ لیس منا من ماکر مسلماً۔ (کافی، ج۲، ص۳۳۷)
ترجمہ: "جو مسلمان کو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

2. امیر المومنین حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:
لایعاب المرء بتأخیرحقّه انما یعاب من اخذ مالیس له۔
(نہج البلاغہ۔ کلمات قصار/۱۶۶)
ترجمہ: "اپنا حق لینے میں تاخیر کرنا انسان کے لئے عیب نہیں ہے بلکہ عیب یہ ہے کہ جو اس کا نہیں ہے اسے حاصل کرے۔

3. قال الصادق علیہ السلام۔ لیس منا من لم یوقر کبیرنا ویرحم صغیرنا۔ (کافی، ج۲، ص۱۶۵)
ترجمہ: "جو ہمارے بڑے کی عزت اور چھوٹے پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

4. قال الامام موسیٰ کاظم علیہ السلام لیس منا من لم یحاسب نفسه فی کل یوم۔ (کافی، ج۲، ص۴۵۳)
ترجمہ: "جو ہر روز اپنا محاسبہ نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

5. قال الصادق علیہ السلام۔ لیس منا من لم یملك نفسه عند غضبه۔ (کافی، ج۲، ص۶۳۷)
ترجمہ: "جو غصے کے وقت خود پر کنٹرول نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

6. قال الصادق علیہ السلام۔ لیس منا من لم یحن مجاورة من جاورہ۔ (کافی، ج۲ص۶۶۸)
ترجمہ: " جو اپنے پڑوسیوں سے اچھا سلوک نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لکل شئی وجه ووجه دینکم الصلاة فلایشینن احد کم وجه دینه۔

(کافی، ج۳، ص۲۷۰)

ترجمہ: "ہر چیز کا ایک چہرہ ہوتا ہے اور تمہارے دین کا چہرہ نماز ہے۔ پس کوئی بھی اپنے چہرے کو خراب نہ کرے۔"

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

قلیل الحق یدفع کثیر الباطل کما ان القلیل من النار یحرق کثیرا الحطب۔

(عیون الحکم المواعظ، ص۳۷۱)

ترجمہ: "تھوڑا سا حق بھی باطل کی کثرت کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح تھوڑی سی آگ بہت سی لکڑیوں کو جلا دیتی ہے۔"

حسن الظن راحة القلب و سلامة البدن۔ (عیون الحکم المواعظ، ص۲۲۹)

ترجمہ: "خوش گمانی سکون قلب اور جسم کی سلامتی کا باعث بنتی ہے۔"

حفظ الدین ثمرة المعرفة و راس الحکمة۔ (عیون الحکم المواعظ، ص۲۳۱)

ترجمہ: "دین کی حفاظت کرنا معرفت کا نتیجہ اور حکمت کا سرمایہ ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من اتقی الله واصلح فهومنا اهل البیت۔ (تفسیر نور الثقلین، ج۲، ص۵۴۸)

ترجمہ: "جو تقویِ الٰہی اختیار کرتا ہے اور اپنی اصلاح کرتا ہے وہ ہم اہل بیتؑ میں سے شمار ہوگا۔

THE BASIC PRINCIPLES OF THE STUDY OF THE QURAN (3)

By: ***Dr. Sheikh Muhammad Hasnain****

Key Words: *Understanding of the Quran, Study, Principles, Qulb, Heart, Intellect, Nature, Nafs, Piety, Guidance*

Abstract

In this article, the fourth principle of the study of the Quran and its comprehension have been discussed. According to this principle, it is imperative to be pious (muttaqi) to get the light of guidance from the Quran. Quran has related piety to heart (dil) and has termed it as a particular condition of the former. The heart which possess this condition has been called as 'qalb-e salim' by the Quran. The heart, on the other side, which is devoid of this condition is not the heart in itself from the perspective of the Quran. It has also been discussed in this article that the heart about which the Quran talks, is not the one which is made of flash and pumps blood in veins. Rather, it refers to the soul of human beings which is a nonphysical and spiritual phenomenon. Moreover, this article attempts to analyze the point that how it is possible to that Quran become the book of guidance to those who are irreligious, let alone pious.

**.Editor Noor-e-Marfat; a prominent research Scholar in religious Studies Principal AIMS School & College.*

THE DIFFERENCE BETWEEN THE QURANIC EXEGESIS BY PERSONAL OPINION (RA'IY) AND BY REASON (AQL)

By: ***Nazr Hafi****

Key words*: Exegesis by personal opinion (tafseer bi al-ra'iy), Exegesis by Reason (Tafseer-e Aqli), Sciences, Argument, Reasoning, Logic, Philosophy, Analogy, Acquaintance*

Abstract:

The correct comprehension of the Quran Is a basic need of Humans of every times. The comprehension of the Quran holds beauty in itself. It is unfortunate, however, that some people present their fallacious understandings as representative of the Quran by employing tafseer bi al-ra'iy. Given that the majority of people do not have the deep understanding of the religion, some self-positioned exegetists present their own hypothesis to them by altering the spirit of the Quran. To block the way of tafseer bi al-ra'iy, it is important to educate the people about the concept of tafseer, its significance, types and rules. An attempt has been made in this article to highlight the difference between the aforementioned types of the tafseer. The author is of the view that if the general public come to know the characteristics of tafseer bi al-ra'iy, they will never accept it.

**.Qom seminary Graduate, Islamic studies scholar at Imam Khomeini School Qom.*

THE ASCRIPTION (INTISAB) OF HUSNAIN (IMAM HASAN AND HUSSAIN) TO THE PROPHET IN THE VIEW OF QURANIC EXEGETISTS

By: ***Syed Rameez-ul-Hasan Mosavi****

Key words: *Hasnain Sharifain, The Prophet of God (PBUH), Progeny, Imam Ali (AS), Hazrat Fatimah (AS), Quranic Exegetists (mufassireen)*

Abstract

In Islam, the personalities of uswa (role model) have a special significance. According to the Quran, the greatest role model of Islam is the Holy Prophet. After him, some other noble personalities are role models by divine ordinance and the practice of the Prophet. Among the personalities are Imam Hasan and Imam Hussain (peace be upon both of them). Some researchers and exegetists, from both Shia and Sunni branch of Islam, call them as 'sons' of the noble Prophet. In this article, an attempt has been made to see whether the practice of calling Husnain as sons and progeny of the Prophet is a religious fact or just a customary ascription. The issue has been analyzed in juxtaposing it with the view of some of the Shia and Sunni exegetists. Finally, it has been proved that relating Husnain to the Prophet as his 'sons' is a religious fact.

**.Sub-editor Noor-e-Marfat; a famous research scholar & Director NMT; Bara Khau, Islamabad.*

THE SIGNIFICANCE OF RECONCILIATION (SULH) AND ITS CONDITIONS: A STUDY IN THE LIGHT OF NAHJ AL-BALAGHAH

By: ***Roushan Ali****

Key words: *Reconciliation, Pledge, fulfillment of pledges, Vigilance, Friend, Enemy, Negligence, deception*

Abstract

One of the debatable issue of Islamic political and social system is the question of reconciliation with opponents, its conditions, its dimensions, and its scope. Islamic has a decisive political and theological stand against opponents, it, nonetheless, directs its adherents to live with their adversaries like peaceful neighbors. In this article, the significance, importance and conditions of reconciliation has been discussed in the light of Nahj al-Balaghah. In this article, an attempt has been made to substantiate that reconciliation must be aimed at pleasing God so that the society may become an adobe of peace and tranquility. Once the terms of reconciliation are agreed upon, it is obligatory to honor them as breaking them is tantamount to rebel against God and is a grave sin.

**.Assistant Professor; IMCB, F-10/3; Islamabad.*

THE INCIDENT OF HIRRAH: A BLACK CHAPTER IN THE HISTORY

Sajid Ali Goundal*

Key Words: *the Incident of Hirrah, The Companions of the Prophet (PBUH), Yazid b. Muawiyah, Muslim b. Uqbah, Abdullah b. Hanzhala*

Abstract

In this article, a historical analysis of what is known as the 'incident of Hirrah' has been presented. This incident is one of the most tragic incidents of the history of mankind, occurred in 63 AH during the reign of Yazid b. Muawiyah. When the people of Medina came to know about the sinful character of Yazid, they rose in rebellion against him. When the news of the outbreak of the uprising reached to the ears of Yazid, he, at first, tried to suppress it by some of his close associates. When Yazid realized that the people of Madena were not ready to accept his caliphate, he dispatched an army under the headship of Muslim b. Uqbah to bow them before him by the might of sword. When the Syrian army arrived in Madena, it succeeded crossing the trench with the assistance of Bani Haritha. The Syrian army, took massacred the Madinites indiscriminately. The soldiers of the Syrian army killed many companions of the Prophet, dishonored Muslim women. The brutality of the Syrian army lasted for three days after which Madinites found no option other then submission.

*.Student at MIU, Qum & researcher in Islamic studies.

EDITORIAL BOARD

Dr. Sh. Muhammad Hasnain
MIU, Islamabad.

Dr. Ali Raza Tahir
Punjab University, Lahore

Dr. Roshan Ali
IMCB, Islamabad.

Dr. Abou Turab
QIU, Islamabad

Dr. Sajid Ali Subahani
MIU, Islamabad.

NATIONAL ADVISORY BOARD

Dr. Syed Nisaar Ali Hamdani
AJKU, AJK

Dr. Hafiz Muhammad Sajjad
AIOU, Islamabad.

Dr. Karam Hussain Wadhoo
Larkana Regional Directorate of Colleges

Dr. Syed Qandeel Abbas Kazmi
QIU, Islamabad

Dr. Muhammad Riaz
Qaraqurm Univ. GB,

INTERNATIONAL ADVISORY BOARD

Dr. Syed Rashed Abbas Naqvi
Ahlulbayiat Univ. Tehran.

Dr. Yaqoob Bashvi
MIU, Qum, Iran

Dr. Syed Talmeez Hasnain Rizvi
New Jerci, America

Dr. Ghulam Hussain Meer
MIU, Qum, Iran

Dr. Sukaina Hussain
Australia

Registration

Pakistan: 500 PKR Middle East: 070 $ USA, Canada, Europe: 150 $

Declaration No:7334 *ISSN 2221-1659*

Quarterly Research Journal

NOOR-E-MARFAT

Vol # 9
Issue: 3
July - Sep
2018
According to
Ziqaad - Muharam
1439-40

Noor-e-Marfat is indexed & Abstracted by Islamic Research Index (IRI) AIOU & HEC.

Chief Editor
S. Hasnain Abbas Gardezi

Editor
Dr. Sh. Muhammad Hasnain

Sub-Editor
S. Rameez ul Hasan Mosvi

SUPERVISORY BOARD

S. Imtiaz Ali Rizvi
Chief Supervisor

S. Ali Murtaza Zaidi
Supervisor

S. Naeem ul Hasan Naqvi
Manager Managerial Issues

Thair Abbas
Office Assistant

Babar Abbas
Composer/Designiner

PUBLISHER: Syed Hasnain Abbas Gardezi

PRINTERS: Pictorial Press, Abpara, Islamabad.

IMPORTANT NOTE:

The Editor is not essentially agreed with author.

نبی اکرم ﷺ کے ذریعے حق کی طرف ہدایت و تبلیغ

امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا:

اللّٰهُمّ صَلّ عَلَى مُحَمّدٍ وَ آلِهِ، كَمَا هَدَيْتَنَا بِهِ، وَ صَلّ عَلَى مُحَمّدٍ وَ آلِهِ، كَمَا اسْتَنْقَذْتَنَا بِهِ، وَ صَلّ عَلَى مُحَمّدٍ وَ آلِهِ، صَلَاةً تَشْفَعُ لَنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ يَوْمَ الْفَاقَةِ إِلَيْكَ، إِنّكَ عَلَى كُلّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، وَ هُوَ عَلَيْكَ يَسِيرٌ.

اللّٰهُمّ اجْزِهِ بِمَا بَلّغَ مِنْ رِسَالَاتِكَ، وَ أَدّى مِنْ آيَاتِكَ، وَ نَصَحَ لِعِبَادِكَ، وَ جَاهَدَ فِي سَبِيلِكَ، أَفْضَلَ مَا جَزَيْتَ أَحَداً مِنْ مَلَائِكَتِكَ الْمُقَرّبِينَ، وَ أَنْبِيَائِكَ الْمُرْسَلِينَ الْمُصْطَفَيْنَ، وَ السّلَامُ عَلَيْهِ وَ عَلَى آلِهِ الطّيّبِينَ الطّاهِرِينَ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ.

یعنی: "اے اللہ! محمد ﷺ اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما جس طرح تو نے ان کے وسیلہ سے ہماری ہدایت فرمائی ہے۔ تو محمد ﷺ اور ان کی آل رحمت نازل کر جس طرح ان کے ذریعہ ہمیں (گمراہی کے بھنور سے) نکالا ہے۔ تو محمدؐ اور ان کی آلؑ پر رحمت نازل کر، ایسی رحمت جو قیامت کے روز اور تجھ سے احتیاج کے دن ہماری سفارش کرے۔ اس لئے کہ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور یہ امر تیرے لیے سہل و آسان ہے۔

اے اللہ! تو انہیں جزا دے تیرے پیغامات کی تبلیغ پر؛ تیری آیتوں کو پہنچانے اور تیرے بندوں کو پند و نصیحت کرنے پر اور تیری راہ میں جہاد کرنے پر، انہیں اس پر اُس جزا سے بہتر جزا دے جو تو نے مقرب فرشتوں اور برگزیدہ مرسل نبیوں کو عطا کی ہو اور ان پر اور ان کی پاک و پاکیزہ آل پر سلام ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ان کے شامل حال ہوں۔"

(صحیفہ کاملہ، دعا نمبر ۴۲، ۳۱ سے اقتباس)

QUARTERLY SOCIAL / RELIGIOUS RESEARCH JOURNAL

NOOR-E-MARFAT

Vol # 9 Issue: 3 Continues Issue: 41

July - Sep 2018

Editor

Dr. Sh. M. Hasnain

NMT (Islamabad)

www.nmt.org.pk > Noor e Marfat

Ph:051-2231937